سیرۃُ الرسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کی

شخصی و رِسالتی اَہمیت

تحقیق و تدوین:

ڈاکٹر طاہر حمید تنولی

منہاجُ القرآن پبلیکیشنز

365-ایم، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون: 5168514، 042-111-140-140

یوسف مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور، فون: 042-7237695

www.Minhaj.org - sales@Minhaj.org

www.MinhajBooks.com

منہاج انٹرنیٹ بیورو کی پیشکش

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مَولَایَ صَلِّ وَسَلِّمْ دَآئِمًا اَبَدًا

عَلٰی حَبِیْبِکَ خَیْرِ الْخَلْقِ کُلِّهِمِ

مُحَمَّدٌ سَیِّدُ الْکَوْنَیْنِ وَالثَّقَلَیْنِ

وَالْفَرِیْقَیْنِ مِنْ عُرْبٍ وَّمِنْ عَجَمِ

www.MinhajBooks.com

منہاج انٹرنیٹ بیورو کی پیشکش

حکومتِ پنجاب کے نوٹیفکیشن نمبر ایس او (پی۔۱) ۴-۱/ ۸۰ پی آئی وی، مؤرّخہ ۳۱ جولائی ۱۹۸۴ء؛ حکومتِ بلوچستان کی چٹھی نمبر ۸۷-۴-۲۰ جنرل وایم ۴/۷۰-۹-۳۷، مؤرّخہ ۲۶ دسمبر ۱۹۸۷ء؛ حکومتِ شمال مغربی سرحدی صوبہ کی چٹھی نمبر ۱۱۴۲۴-۶۷ این۔۱/ اے ڈی (لائبریری)، مؤرّخہ ۲۰ اگست ۱۹۸۶ء؛ اور حکومتِ آزاد ریاست جموں و کشمیر کی چٹھی نمبر س ت/ اِنتظامیہ ۶۳-۸۰۶۱/ ۹۲، مؤرّخہ ۲ جون ۱۹۹۲ء کے تحت ڈاکٹر محمد طاہرالقادری کی تصنیف کردہ کتب تمام سکولز اور کالجز کی لائبریریوں کے لئے منظور شدہ ہیں۔

جملہ حقوق بحقِ تحریکِ منہاجُ القرآن محفوظ ہیں

نام کتاب : سیرۃُ الرسول ﷺ کی شخصی و رِسالتی اَہمیت

تصنیف : شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری

تحقیق و تدوین : ڈاکٹر طاہر حمید تنولی

تخریج : محمد ضیاء الحق رازی

زیرِ اِہتمام : فریدِ ملّت رِیسرچ اِنسٹی ٹیوٹ Research.com.pk

مطبع : منہاجُ القرآن پرنٹرز، لاہور

اِشاعتِ اَوّل : ستمبر 2007ء

تعداد : 1,100

قیمت اِمپورٹڈ کاغذ : -/80 روپے

✿ ✿ ✿

نوٹ: شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی تمام تصانیف اور ریکارڈڈ خطبات و لیکچرز سے حاصل ہونے والی جملہ آمدنی اُن کی طرف سے ہمیشہ کے لیے **تحریکِ منہاجُ القرآن** کے لیے وقف ہے۔

(ڈائریکٹر منہاجُ القرآن پبلی کیشنز)

sales@minhaj.org

فہرس

صفحہ	مشتملات
۹	پیش لفظ
۱۳	۱۔رسالت محمدی ﷺ کی آفاقیت و عالمگیریت
۱۴	۲۔شخصیت محمدی ﷺ کی جامعیت و ہمہ گیریت
۱۵	۳۔دین وشریعت محمدی کا اعجاز
۱۷	اِعجازِ قرآن کے دلائل
۱۷	(۱) عدمِ مثلیت
۲۰	(۲) حفاظت کا اُلوہی اہتمام
۲۵	(۳) عدمِ اختلاف و تناقض
۲۶	(۴) ندرتِ اُسلوب و نظمِ کلام
۲۹	(۵) فصاحت و بلاغت
۳۰	(الف) مجاز و کنایہ
۳۱	(ب) تشبیہ و استعارہ
۳۲	(۶) صوتی حسن و ترنم

www.MinhajBooks.com

منہاج انٹرنیٹ بیورو کی پیشکش

www.MinhajBooks.com

صفحہ	مشتملات
۳۴	(۷) احوالِ غیب کا بیان
۳۵	ا۔ اُمَمِ سابقہ کے اَحوال و واقعات
۳۶	ب۔ مستقبل کی پیشین گوئیاں
۳۶	i. غلبۂ روم کی پیشین گوئی
۳۷	ii. فتح مکہ کی پیشین گوئی
۳۸	iii. فتحِ خیبر کی پیشین گوئی
۳۹	iv. غلبۂ اسلام کی پیشین گوئی
۴۱	(۸) نتیجہ خیزی کی ضمانت
۴۳	(۹) اُمیّتِ صاحبِ قرآن
۴۵	۴۔ شخصی فضائل و خلق محمدی ﷺ کی کاملیت
۴۶	(۱) خلقِ محمدی ﷺ کا معاشرتی پہلو
۴۷	(۲) خلقِ محمدی ﷺ میں عفو کا پہلو
۵۰	(۳) خلقِ محمدی ﷺ میں حلم کا پہلو
۵۰	(۴) خلقِ محمدی ﷺ میں حیا کا پہلو
۵۱	(۵) خلقِ محمدی ﷺ میں سخاوت کا پہلو
۵۲	(۶) خلقِ محمدی ﷺ میں صبر کا پہلو

مشتملات	صفحہ
(۷)خلقِ محمدی ﷺ اور مخلوق پر رحمت وشفقت	۵۴
(۸)خلقِ محمدی ﷺ میں تواضع کا پہلو	۵۵
۵۔تعلیماتِ محمدی ﷺ کی حفاظت و دائمیت	۵۶
احادیثِ نبوی ﷺ کی حفاظت و دائمیت	۷۱
احادیثِ نبوی ﷺ کی حفاظت کا نادر الوجود منہج	۷۲
(۱) راوی حفظ و روایت کی اعلیٰ صلاحیت کا حامل ہو	۷۴
(۲) راوی معروف ہو	۷۴
(۳) راوی مقبولیت کا حامل ہو	۷۴
(۴) راوی کے کردار پر تنقید موجود نہ ہو	۷۵
(۵) سماجی وقار و آداب کا حامل ہو	۷۵
۶۔رسالتِ محمدی ﷺ کی خاتمیت	۷۵
۷۔مقاصدِ بعثت رسالت کی تمامیت	۸۱
۞ مآخذ ومراجع	۸۵

www.MinhajBooks.com

پیش لفظ

اللہ رب العزت نے انسانیت کی رہنمائی کے لئے تخلیق انسانیت کے ساتھ ہی اِس کرۂ ارض پر نبوت و رسالت کے سلسلے کو قائم فرمایا۔ جس کا مقصود انسانیت کو بتدریج ایک ایسا مکمل ضابطۂ حیات عطا کرنا تھا جس پر عمل پیرا ہوتے ہوئے وہ نہ صرف اپنے ظاہر و باطن کی تکمیل کر سکے بلکہ دنیا و آخرت میں کامیابی کا حصول بھی اس کے لئے یقینی ہو۔ انبیاء کرام علیہم السلام ہر دور میں اپنے فرائضِ نبوت اور اللہ کے عطا کردہ نظام کی روشنی میں انسانیت کی تعمیر کا کردار ادا کرتے رہے۔ انفرادی سطح پر تشکیلِ کردار ہی ایک بہترین قوم کی تشکیل میں معاون ہوتا ہے۔ یعنی اگر ایک مثالی قوم یا مثالی معاشرہ کی تشکیل کرنا مقصود ہو تو اس کی خشتِ اوّل ایسے افراد ہوں گے جو مثالی کردار کے حامل ہوں۔ یہ سوال کہ انفرادی سطح پر ایک مثالی کردار کیسے میسر آئے جو ایک بہترین معاشرے اور قوم کی تعمیر میں ممد و معاون ہو، کا شافی جواب سیرت الرسول ﷺ سے میسر آتا ہے۔

حضور نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ مبارکہ انسانی زندگی کی تمام جہات کے لئے ایک مکمل اُسوۂ حسنہ ہے۔ کیونکہ انسانی وجود کی تمام جہات جس بنیادی نکتہ سے پھوٹتی ہیں وہ اس کی شخصیت اور ذات ہے۔ لہٰذا اس کے تمام پہلوؤں کو روبہ اصلاح اور ارتقاء پذیر کرنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے اس کی خشتِ اوّل، بنیاد اور مرکز یعنی شخصیت اور ذات پر توجہ دی جائے۔ حضور نبی اکرم ﷺ کی شخصیتِ مبارکہ اس حیثیت میں ایک بے مثل نمونۂ کامل ہے۔ سیرتِ مبارکہ سے ملنے والے راہنما اوصاف، خصائل اور کمالات کے پیشِ نظر انسانی شخصیت اپنی تکمیل کے لئے ایک واضح لائحہ عمل اور رہنمائی کا سامان اخذ کر سکتی ہے۔

حضور نبی اکرم ﷺ کی ذات اور شخصیتِ مبارکہ اس حوالے سے بھی امتیازی

شان کی حامل ہے کہ آپ کی ذاتِ اقدس میں شخصیت و رسالت ایک اکائی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یعنی آپ کی شخصیت جس رسالت کی بنیاد ہے اس کی تعلیمات کا مظہرِ اتم بھی ہے اور وہ رسالت جس کے منصب سے اللہ رب العزت نے آپ کو نواز کر ختم نبوت کی شان عطا کی اس کا عملی مظہر آپ کی شخصیت اور ذاتِ مبارکہ ہے۔ آپ کی ذاتِ مبارکہ کے مطالعہ کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ انسانی شخصیت کی سطح پر مثالی کردار کی تعمیر کیونکر ممکن ہے اور اگر اس تناظر میں حضور نبی اکرم ﷺ کی شخصیت مبارکہ سے رہنمائی اخذ کی جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ کائناتِ انسانی میں اس سے بہتر نمونہ عمل اور کوئی میسر نہیں آ سکتا جبکہ اس کی دوسری جہت یعنی رسالتی اہمیت آپ کی ذاتِ مبارکہ کا وہ پہلو ہے جو انسانیت کو اپنے خالق سے وابستہ کرنے اور دین و دنیا میں کامیابی و کامرانی اور فلاح کے حصول کے لیے اُلوہی ضوابط پر عمل پیرا ہونے کی صورت سے آشنا کرتا ہے۔

شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری مدّظلہ العالی کی زیرِ نظر تصنیف میں حضور نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ مبارکہ کی شخصی جہت کے چند گوشوں کو واضح کرنے اور اُن سے نورِ ہدایت اَخذ کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ جو اس حقیقت کو واضح کرنے میں ممد و معاون ہوگی کہ ختمِ نبوت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ انسانیت کے لئے - دُنیوی زندگی میں درجۂ کمال کو پانے یا آخرت کی زندگی میں فلاح کے حصول کے لئے - بہترین نمونۂ عمل حضور نبی اکرم ﷺ کی شخصیت اور ذاتِ مبارکہ سے ہی میسر آ سکتا ہے۔

ڈاکٹر طاہر حمید تنولی
ناظم تحقیق
تحریکِ منہاجُ القرآن

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تاریخِ انسانیت کے تناظر میں حضور نبی اکرم ﷺ کی ذات مبارکہ اور آپ کی شخصیت کا مطالعہ اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ نہ صرف امت مسلمہ بلکہ انسانیت کو درپیش ابدی تقاضوں کے پیشِ نظر حضور نبی اکرم ﷺ کی سیرت طیبہ کا مطالعہ ایک ناگزیر ضرورت کی حیثیت رکھتا ہے۔ اللہ رب العزت نے زمین پر سیدنا آدم علیہ السلام کو اتارتے ہی انسانیت کے لیے ہدایت کا سلسلہ جاری فرما دیا تھا۔ یعنی کرہ ارض پر پہلا انسان ہی اپنے آنے والی نسل کے لئے زندگی گزارنے کے رہنما اصول بھی واضح کر رہا تھا۔ جوں جوں انسانی معاشرہ آگے بڑھتا گیا اللہ کی ہدایت کا سلسلہ بھی فروغ پذیر رہا اور نوع بہ نوع پیدا ہونے والے مسائل اور تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کیلئے اس کا دائرہ وسیع ہوتا چلا گیا۔ تاآنکہ اللہ رب العزت کا قائم کردہ یہ سلسلہ وحی اور رشد و ہدایت حضور نبی اکرم ﷺ کی ذات مبارکہ پر آ کر درجہ کمال کو پہنچ گیا۔ بقول اقبالؔ:

آتش او صد ابراھیم سوخت

تا چراغ یک محمد برفروخت

آپ کی شخصیت اور رسالت اس تناظر میں سلسلہ انبیاء علیہم السلام کے تکمیلی عنصر کی حیثیت رکھتی ہے۔ آپ ﷺ نے خود ارشاد فرمایا:

مثلي ومثل الأنبياء كمثل رجل بنى بنيانا فأحسنه وأجمله فجعل الناس يطيفون به يقولون ما رأينا بنيانا أحسن من هذا إلا هذه اللبنة فكن أنا تلك اللبنة۔(۱)

---

(۱) ۱۔ مسلم، الصحیح، کتاب الفضائل، باب ذکر کونه خاتم النبیین، ۴: ——

’’میری اور مجھ سے پہلے انبیاء کی مثال اس شخص کی طرح ہے جس نے ایک مکان بنایا اور کیا ہی حسین وجمیل مکان بنایالوگ اس مکان کے گرد گھوم کر کہنے لگے ہم نے اس مکان سے اچھا کوئی مکان نہیں دیکھا مگر اس میں ایک اینٹ نہیں ہے سو میں وہ اینٹ ہوں۔‘‘

منصبِ نبوت و رسالت کے علاوہ آپ کی ذات مبارکہ کو شخصی حوالے سے بھی دیکھا جائے تو اس حوالے سے بھی آپ ﷺ کی سیرت کا مطالعہ انسانیت کے لیے واضح رہنمائی کا سامان رکھتا ہے۔ وہ عظیم پیغام جو حضور نبی اکرم ﷺ انسانیت کے لیے لے کر آئے اس کے ابلاغ کے جتنے بھی پہلو یا جہات ہوسکتی تھیں ان پر آپ ﷺ نے وحی کا ابلاغ فرمایا۔ تاہم آپ ﷺ نے ابلاغ کی دو معروف اور ضروری جہات کا کماحقہ احاطہ فرمایا۔ ایک اللہ کے نظام ہدایت کا بطور ایک علمی، فکری اور دیرپا رہنے والی روایت کی صورت میں مستقل ابلاغ ہے۔ اللہ کے پیغام ہدایت کا ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرف آج ہمارے سامنے مکمل طور پر محفوظ ہے۔ یہ علمی روایت نہ صرف دستاویزی صورت میں محفوظ ہے بلکہ اسے صدیوں کی سینہ بہ سینہ چلنے والی شخصی اور ذاتی و روایاتی تسلسل کی تائید اور توثیق بھی میسر ہے۔ یہ ابلاغ اس وقت تک نامکمل رہتا اگر اس کا عملی نمونہ موجود نہ ہوتا۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے اللہ کی طرف سے ملنے والے اس نظام ہدایت کا ابلاغ علمی وفکری سطح پر ایک ثقہ روایت کی شکل میں ہی نہیں کیا بلکہ اپنے عمل اور شخصیت و کردار سے بھی اس کو ایک کامل نمونہ کے طور پر بھی پیش فرمایا۔ یہی وجہ ہے کہ پہلے انسان سے لے کر آج تک شاید ہی کوئی ایسی شخصیت موجود ہو جس کی سیرت کے مطالعہ سے، نشست و برخاست اور خلوت وجلوت سے لے کر انفرادی قومی اور بین الاقوامی معاملات تک رہنمائی میسر آتی ہو۔ حضور نبی اکرم ﷺ کی ذات مبارکہ اللہ رب العزت کے عطا کردہ پیغام کا

------- ۱۷۹۰، رقم: ۲۲۸۶

۲۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۲: ۲۵۶، رقم: ۷۴۷۹

عملی نمونہ اور انسانی زندگی کے اندازِ فکر سے لے کر عمل تک جملہ سوالات کا ایسا جامع اور شافی جواب ہے جس کی کوئی نظیر تاریخ انسان سے پیش نہیں کی جاسکتی۔ اس باب میں ہم حضور نبی اکرم ﷺ کی اسی شخصی اور رسالتی جہت کے حوالے سے کچھ پہلوؤں کا احاطہ کر رہے ہیں۔

۱۔ رسالتِ محمدی ﷺ کی آفاقیت اور عالم گیریت

حضور نبی اکرم ﷺ کی نبوت و رسالت کو آفاقی اور عالمگیر بنایا گیا جب کہ آپ ﷺ سے قبل جماعت انبیاء میں سے کسی کی نبوت کا دائرہ اس قدر وسیع نہ تھا ہر پیغمبر کو کسی نہ کسی خاص علاقے، ملک، قوم، آبادی، شہر یا قریہ کی طرف مبعوث کیا جاتا اور وہی لوگ اس کے مخاطب ہوتے۔ مزید یہ کہ ان کی بعثت ایک خاص زمانے کے لئے ہوتی ان کے وصال کے بعد اگلی نسلوں کے لئے اور پیغمبران گرامی مبعوث کر دیئے جاتے۔ مگر حضور نبی اکرم ﷺ کی بعثت مبارکہ زمان و مکان کی جملہ حدود سے آگے بڑھ گئی۔ نہ تو آپ ﷺ کی نبوت و رسالت خاص خطہ عرب کے لئے تھی اور نہ صرف آپ ﷺ کی حیات ظاہری یا اس کے بعد ایک مخصوص زمانے تک کے لئے بلکہ آپ ﷺ کی بعثت تمام عالم انسانیت کے لئے ہوئی جس میں شرق تا غرب جملہ اقوام عالم شامل ہیں۔ اسی طرح نبوت و رسالت محمدی ﷺ کا زمانہ بلاشرکت غیرے روز قیامت تک عملاً برقرار رہے، بلکہ آپ ﷺ کی رسالت کی فرمانروائی روزمحشر بھی جاری وساری ہوگی۔ مقام محمود آپ ﷺ کا تخت ہوگا، شفاعت آپ ﷺ کا نظام سلطنت ہوگا، لواء الحمد آپ ﷺ کا علم عظمت ہوگا، تمام کائنات انسانی آپ ﷺ کے در پر سائل اور آپ ﷺ کے تابع احسان ہوگی اور آپ ﷺ تمام اقوام و امم کے محسن اور قائد و شفیع ہوں گے حتی کہ اختتام حشر پر جنت کا افتتاح بھی آپ ﷺ ہی کے دست مبارک سے کروایا جائے گا۔ اور آپ ﷺ سے قبل اولین و آخرین میں سے کسی کو جنت میں داخلے کی اجازت بھی نہ ہوگی۔

۲۔ شخصیتِ محمدی ﷺ کی جامعیت و ہمہ گیریت

حضور نبی اکرم ﷺ کی شخصیت و سیرت کو ہر لحاظ سے جامع اور ہمہ گیر بنایا گیا ہے تاکہ انسانی زندگی کی انفرادی سطح سے لے کر بین الاقوامی سطح تک ہر گوشے اور ہر پہلو کے لئے مطلوبہ ہدایت اور نمونہ کامل آپ ﷺ ہی کی ذت گرامی سے میسر آ سکے۔ مزید برآں زندگی کے نجی و عائلی معاملات سے لے کر سیاسی و ریاستی معاملات تک کی رہنمائی کے لئے امت کو اپنا دامن طلب کسی اور کے سامنے نہ پھیلانا پڑے۔

دنیا میں جتنی شخصیات بھی تاریخ عالم کے نقشہ پر نمایاں طور پر ابھری ہیں وہ اپنی انفرادیت میں یک حیثیتی ہیں مثلاً سکندر اَعظم، نپولین اور ہٹلر وغیرہ بڑے نام وَر فاتح اور سپہ سالار تھے۔ گوتم بدھ اور مہاویر سوامی خصوصی عبادات و ریاضات اور مراقبات و مجاہدات میں نمایاں تھے اشوک ایک نامور حکمران تھا۔ کنفیوشس ایک بڑا سماجی مصلح تھا، افلاطون اور ارسطو بڑے فلسفی اور صاحبان حکمت تھے اور نیوٹن اور گلیلیو عظیم سائنس دان تھے۔ الغرض ان تمام تاریخی شخصیات کی زندگیاں کسی نہ کسی ایک شعبہ ومیدان میں نمایاں ہوتی ہیں اور صرف اس شعبہ سے شغف رکھنے والوں کے لئے دلچسپی کا باعث ہوتی۔ ہیں لوگوں کو دیگر شعبہ ہائے زندگی میں ان سے کوئی خاص رہنمائی نہیں مل سکتی اور نہ ہی ان کے سوانح و حالات تمام جہات حیات میں سبق آموز ہوتے ہیں بلکہ ان کے کئی شعبہ جات زندگی رہنمائی حاصل کرنے والوں کے لئے بالکل خاموش اور خالی دکھائی دیتے ہیں۔ مگر حضور نبی اکرم ﷺ کی حیات مبارک ان سے یکسر مختلف نہایت جامع و مانع، ہمہ جہت اور ہمہ گیر حیثیت کی حامل دکھائی دیتی ہے وہ ہر شعبہ حیات میں فلک عظمت پر آفتاب کی طرح چمک رہی ہے اور ہر میدان سے شغف رکھنے والوں کے لئے برابر مینارۂ نور ہے۔

ایک عام شہری ہو یا کسی خاندان کا سربراہ، کوئی شوہر یا کسی کا باپ، مذہبی روحانی رہنما ہو یا کوئی تاجر ہو یا رفاہی کارکن، سیاسی رہنما ہو یا ریاستی سربراہ، عالم وخطیب ہو یا مربی و مرشد، مقنن اور جج ہو یا سپاہی اور جرنیل، حکیم و فلسفی ہو یا کوئی مبلغ اخلاق،

الغرض ہر ایک شخص اپنی زندگی کے مخصوص حالات و مقتضیات کے مطابق جس نوعیت کی بھی ہدایت اور نمونہ اطاعت کا طلبگار ہوتا ہے اسے اسی ایک ہی سیرت طیبہ سے نصیب ہو جاتا ہے۔ کسی کو بھی کہیں اور جانے کی حاجت نہیں ہوتی۔ یہاں تک کہ مرد و زن، بچے، بوڑھے اور جوان اپنے اپنے طرزِ عمل کو درست کرنے اور اپنے مسائل حیات کو حل کروانے کے لئے اسی دروازے پر آتے ہیں۔ ہر ضرورت مند کو اپنی تمام ضرورت کا سارا سامان اسی ایک ہی در سے میسر آتا ہے۔ باری تعالیٰ نے آپ ﷺ کی سیرت اور تعلیمات میں اس قدر جامعیت اور ہمہ گیریت پیدا فرما دی ہے جو اول کائنات سے آخر کائنات تک نہ کسی کو عطا کی گئی اور نہ میسر آسکے گی۔ اسی ہمہ گیر اثر انگیزی کا ذکر کرتے ہوئے ایک مغربی مفکر یوں لکھتا ہے:

> The essential significance of the appearance of Muhammad is the crystallization of a new experience of the divine, which welded all those who shared it into a new kind of community. The effect of this experience on contemporary relationships is evident and unmistakable in both languages and art. [1]

> ''محمد (ﷺ) کے ظہور کی خصوصیت و اہمیت اس الوہی واردات کی تشکیل میں مضمر ہے جس سے اس عمل میں شریک ہونے والوں کی شیرازہ بندی ایک نئی قوم کی شکل میں ہوئی۔ اس تجربے کا اثر و نفوذ جو عصری روابط کی صورت میں ظاہر ہوا اس کی چھاپ زبانوں اور فنون لطیفہ پر نمایاں نظر آتی ہے۔''

۳۔ دین و شریعتِ محمدی کا اِعجاز

حضور نبی اکرم ﷺ کی شخصیتی اور رسالتی اہمیت کے باب میں ایک اہم پہلو آپ کا عطا کردہ دین اور شریعت کا معجزانہ پہلو ہے۔ پہلے تمام انبیاء کے ذریعے انسانیت کو

(1) Gustave Edmund Von Grunebaum, *Classical Islam: A History, 600-1258*

جو نظام زندگی اور دین دیا گیا وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تبدیلی اور تحریف کی وجہ سے اسکی اصل شکل محو ہوگئی۔ اسلام کی اہمیت یہ ہے کہ صدیاں گزرنے کے باوجود اس کے بنیادی سرچشمے اپنی اصل صورت میں انسانیت کی رہنمائی کے لئے موجود ہیں۔ حضور نبی اکرم ﷺ کو جو معجزات عطا کیے گئے ان میں شریعت اور بنیادی سرچشمہ یعنی قرآن مجید صدیاں گزرنے کے باوجود حرف بہ حرف اسی حالت میں موجود ہے جس حالت میں حضور نبی اکرم ﷺ نے امت کو عطا کیا تھا۔ حضور نبی اکرم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

ما من الأنبياء من نبی إلا قد أعطی من الأيات ما مثله أمن عليه البشر و إنما کان الذی أوتيت وحيا أوحی اللہ إلیٰ فأرجو أن أکون أکثرهم تابعاً يوم القيامة۔[1]

’’پیغمبروں میں سے ہر پیغمبر کو اللہ تعالیٰ نے اِس قدر معجزات عطا کئے جن کو دیکھ کر لوگ ایمان لائے، لیکن جو معجزہ مجھے دیا گیا ہے وہ وحی (یعنی قرآن) ہے جس کو باری تعالیٰ نے مجھ پر اُتارا۔ اس لئے میں امید کرتا ہوں کہ قیامت کے دن میرے پیروکاروں کی تعداد سب سے زیادہ ہوگی۔‘‘

اس حدیثِ مبارکہ میں اللہ رب العزت نے سابقہ اَنبیاء اور رسولوں کو معجزات عطا فرمائے تا کہ لوگ ان معجزات کو دیکھ کر ان انبیاء کی حقانیت پر ایمان لاسکیں اور وہ اللہ رب العزت کے وجود کا اقرار کریں۔ لیکن یہ معجزات دائمی حیثیت کے حامل نہ تھے۔ قوانین،

---

(۱) ۱۔ بخاری، الصحیح، کتاب الاعتصام، باب، قول النبی ﷺ: بعثت بجوامع الکلم، ۶: ۲۶۵۴، رقم: ۶۸۴۶

۲۔ بخاری، الصحیح، کتاب فضائل القرآن، باب کیف نزل الوحی، ۴: ۱۹۰۵، رقم: ۴۶۹۶

۳۔ مسلم، الصحیح، کتاب الایمان، باب وجوب الایمان، ۱: ۱۲۴، رقم: ۱۵۲

۴۔ احمد بن حنبل، المسند، ۲: ۴۵۱، رقم: ۹۸۲۷

ضابطہ ہائے حیات اور شریعتیں بھی ہمیشہ کے لیے نہ تھیں۔ جب حضور نبی اکرم ﷺ پر سلسلہ نبوت و رسالت کا اختتام ہوگیا تو آپ ﷺ کو قرآن حکیم کی صورت میں ایک ایسا معجزہ عطا کیا گیا جس کی حیثیت دائمی ہے۔ نتیجتاً آپ ﷺ کی شریعت نے قیامت تک موجود اور انسانیت کے لیے راہنما رہنا ہے۔ اب چونکہ قیامت کا دن طلوع ہونے تک انسانیت نے راہنمائی آپ ﷺ کے عطا کردہ سرچشمہ ہدایت سے لینی ہے لہٰذا قیامت کے دن تک لوگ اسی ہدایت کی طرف متوجہ اور راغب ہوں گے اور قیامت کے دن آپ کے لوگوں اور پیروکاروں ہی کی کثرت ہو گی۔

اب ہم کلامِ مجید کے اعجاز پر مشتمل چند نکات پیش کرتے ہیں جس سے قرآن کی معجزانہ شان بطریقِ احسن ظاہر ہوتی ہے:

اِعجازِ قرآن کے دلائل

اِعجازِ قرآن کے دلائل میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:

۱۔ عدمِ مثلیت

۲۔ حفاظت کا اُلوہی اِہتمام

۳۔ عدمِ اختلاف و تناقض

۴۔ ندرتِ اسلوب و نظمِ کلام

۵۔ فصاحت و بلاغت

۶۔ صوتی حسن و ترنم

۷۔ احوالِ غیب کا بیان

۸۔ نتیجہ خیزی کی ضمانت

۹۔ اُمیّتِ صاحبِ قرآن ﷺ

(۱) عدمِ مثلیت

قرآن نے جملہ انس و جاں کو مخاطب کرتے ہوئے اعلان کیا ہے کہ ساری مخلوقات اپنی اجتماعی کوششوں کے باوجود اس کا مثل لانے سے قاصر ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

www.MinhajBooks.com

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰی اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَ لَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِیْرًا۝(۱)

’’فرما دیجئے! اگر تمام انسان اور جنات اس بات پر جمع ہو جائیں کہ وہ اس قرآن کے مثل (کوئی دوسرا کلام بنا) لائیں گے تو (بھی) وہ اس کی مثل نہیں لا سکتے اگرچہ وہ ایک دوسرے کے مددگار بن جائیں۝‘‘

دوسرے مقام پر مخالفین کو چیلنج دیا گیا کہ پورے قرآن کا مثل تو درکنار قرآن کے بارے میں نبی اکرم ﷺ پر افتراء پردازی کرنے والے اپنے قول کی تائید میں صرف دس سورتوں کی ہی مثل لے آئیں:

اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَیٰتٍ۔(۲)

’’کیا کفار یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر (ﷺ) نے اس (قرآن) کو خود گھڑ لیا ہے؟ فرما دیجئے: تم (بھی) اس جیسی گھڑی ہوئی دس سورتیں لے آؤ۔‘‘

لیکن اس پر بھی معترضین بے بس رہے تو باری تعالیٰ نے ایک اور چیلنج کیا:

وَاِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ۝(۳)

’’اور اگر تم اس (کلام) کے بارے میں شک میں مبتلا ہو جو ہم نے اپنے (برگزیدہ) بندے پر نازل کیا ہے تو اس جیسی کوئی ایک سورت ہی بنا لاؤ، اور (اس کام کے لئے بیشک) اللہ کے سوا اپنے سب حمائتیوں کو بلا لو اگر تم (اپنے شک اور انکار میں) سچے ہو۝‘‘

---

(۱) بنی اسرائیل، ۱۷: ۸۸

(۲) ہود، ۱۱: ۱۳

(۳) البقرہ، ۲: ۲۳

اس چیلنج کا کوئی جواب نہ دے سکا اور ابدالآباد تک منکرین حق کا ناکامی سے دوچار ہونا مقدر کر دیا گیا ہے، جس کی شہادت چودہ سو سال کی تاریخ دے رہی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

فَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلُوۡا وَلَنۡ تَفۡعَلُوۡا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیۡ وَقُوۡدُهَا النَّاسُ وَالۡحِجَارَةُ اُعِدَّتۡ لِلۡكَافِرِیۡنَ○[1]

''پھر اگر تم نے ایسا نہ کیا اور تم ہرگز نہ کر سکو گے تو اس آگ سے بچو جس کا ایندھن آدمی (یعنی کافر) اور پتھر (یعنی اُن کے بت) ہیں، جو کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے○''

اس قرآنی دلیل کی صداقت اس سے بڑھ کر اور کیا ہوسکتی ہے کہ عالمِ یہودیت اور عالمِ عیسائیت اسلام کے خلاف کس حد تک برسرِ پیکار رہے ہیں۔ تاریخ کا ہر طالبِ علم اس حقیقت سے بخوبی آشنا ہے اور آج بھی اسلامی تعلیمات کو مسخ کرنے اور اسلامیانِ عالم کو گمراہ کرنے کے لئے نہ صرف پرنٹ میڈیا بلکہ اِنٹرنیٹ تک پر کتنی کوششیں یہود و نصاریٰ کے ذریعے دنیا بھر میں ہو رہی ہیں، جو اہلِ بصیرت سے مخفی نہیں، لیکن ان بھرپور مخاصمانہ کاوشوں کے باوجود آج تک قرآن کی کسی ایک سورت یا آیت کی مِثل نہیں بنائی جا سکی اگر اس کے اِلہامی ہونے کا دعویٰ غلط ہوتا تو اس کے مماثل کئی نسخے معرضِ وجود میں آ چکے ہوتے۔ تاریخ شاہد ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد عالمِ عیسائیت میں انجیل کے ۱۳۳ نسخے رواج پا چکے تھے جن میں سے بالآخر ۱۲۹ کو رد کر کے بقیہ چار کو سندِ صحت عطا کر دی گئی۔

آج بھی انجیلِ یوحنا، انجیلِ مرقس، انجیلِ لوقا، انجیلِ متی کے نام سے چار مختلف نسخے موجود ہیں۔ ایک پانچواں نسخہ انجیلِ برنباس کا بھی ہے اور پوری دنیائے عیسائیت ان میں سے کسی ایک پر بھی متفق نہیں ہوسکی۔ اس کے برعکس اسلام کے خلاف اندرونی اور

(۱) البقرہ، ۲: ۲۴

بیرونی سطح پر لاکھوں سازشیں ہوئیں لیکن قرآنِ مجید کا عدمِ مثلیت کا وصف اسی طرح برقرار رہا اور آج بھی تقریباً ایک ارب افراد پر مشتمل ملّت اِسلامیہ صرف ایک ہی متن کو قرآن مانتی ہے اور اس امر میں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا بلکہ صفحہ ہستی پر آج تک قرآن کا کوئی متبادل نسخہ پیش نہیں کیا جاسکا۔ بعض جھوٹے مُدعیانِ نبوت نے جزوی طور پر ایسی جسارت کرنا چاہی لیکن ہمیشہ خاسر و خائب ہوئے۔ اسی طرح اگر کسی اور نے بھی قرآن کی عظمت و اِعجاز کو نہ سمجھتے ہوئے ایسا اِقدام کیا تو وہ بھی ناکام و نامراد ہی رہا۔

ابنِ جوزیؒ ''الوفاء بأحوال المصطفیٰ'' میں امام ابنِ عقیلؒ کے حوالے سے ابو محمد نحویؒ سے روایت کرتے ہیں کہ وہ ایک مرتبہ اِعجازِ قرآن پر گفتگو کر رہے تھے۔ وہاں فاضل شیخ بھی موجود تھا۔ اس نے کہا کہ قرآن میں ایسی کون سی ندرت و کمال ہے جس سے فضلاء و بلغاء عاجز آجائیں۔ پھر وہ کاغذ قلم لے کر بالا خانے پر چڑھ گیا اور وعدہ کیا کہ تین دن کے بعد قرآنِ مجید کی مِثل کچھ لکھ کر لاؤں گا۔ جب تین دن گزر گئے اور نیچے نہ اترا تو ایک شخص بالا خانے پر چڑھا۔ اس نے اسے اس حال میں پایا کہ اس کا ہاتھ قلم پر سوکھ چکا تھا۔ ایسے واقعات فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا (پس اگر تم ایسا نہ کر سکو اور تم ہرگز ایسا نہ کر سکو گے)(۱) کی زندہ شہادت ہیں۔

(۲) حفاظت کا اُلوہی اِہتمام

قرآن حکیم کا دوسرا اعجاز یہ ہے کہ باری تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا وعدہ بھی خود ہی فرمایا ہے:

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَo(۲)

''بے شک یہ ذکرِ عظیم (قرآن) ہم نے ہی اتارا ہے اور یقیناً ہم ہی اس کی

(۱) البقرۃ، ۲: ۲۴

(۲) الحجر، ۱۵: ۹

حفاظت کریں گےo‘‘

چنانچہ وعدۂ اِلٰہی کے مطابق قران آج تک ہر قسم کی کمی وبیشی اور حذف و اضافہ سے محفوظ رہا ہے، اس لئے یہ کامل بھی ہے اور تمام بھی۔ عہدِ رسالت میں قرآنی آیات متعدد اشیاء پر معرضِ تحریر میں لائی جاتی تھیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس دور میں بھی جب بہت کم لوگ لکھنے کے فن سے آشنا تھے پورا قرآن تحریری طور پر موجود و محفوظ تھا، اور اس پر مستزاد خود حضور نبی اکرم ﷺ اور کئی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی قرآن کے حافظ تھے لیکن باقاعدہ طور پر عہدِ صدیقی میں ’مصحف‘ کے نام سے ایک جامع نسخہ مرتب کیا گیا جسے طویل اور مختصر سورتوں کے اعتبار سے ’سبع طوال‘، ’مئین‘، ’مثانی‘ اور ’مفصل‘ میں تقسیم کر دیا گیا لیکن سورتوں اور آیات کی ترتیب بلاکم و کاست وہی رہی جو خود رسول اکرم ﷺ نے بذریعہ وحی مقرر فرما دی تھی۔

عہدِ عثمانی میں پھر تمام صحابہ و اہل بیت اور حفاظ کرام رضی اللہ عنہم کے مکمل اتفاق سے سرکاری طور پر ایک نسخہ تیار کیا گیا جو ’مصحفِ عثمانی‘ کے نام سے معروف ہوا۔ قرآن کی جمع و تدوین کا یہ کام جو سیدنا عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں پایۂ تکمیل تک پہنچا، دراصل خود اللہ تعالیٰ کی نگرانی اور حفاظت میں ہوا کیونکہ ارشادِ ربانی ہے:

اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَ قُرْاٰنَهٗo(۱)

’’بے شک اسے (آپ کے سینہ میں) جمع کرنا اور اسے (آپ کی زبان سے) پڑھانا ہمارا ذِمّہ ہےo‘‘

اس پہلو کا جائزہ لینا بیعتِ رضوان کے حوالے سے نہایت ضروری ہے۔ سوال یہ ہے کہ باری تعالیٰ نے قرآن کی جمع و تدوین کا آخری کام متعدّد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور خلفاء کے باوجود حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ ہی سے کیوں لیا؟ اس کی وضاحت صلحِ حدیبیہ کے واقعہ سے ہوتی ہے جب حضور نبی اکرم ﷺ نے چودہ سو صحابہ رضی اللہ عنہم کے ہمراہ بمقام حدیبیہ پڑاؤ

(۱) القیامہ، ۷۵:۱۷

کیا اورسیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو اہل مکہ کی طرف سفیر بنا کر بھیجا۔ اس اثناء میں اطلاع ملی کہ کفار و مشرکین مسلمانوں پر حملہ آور ہونا چاہتے ہیں۔ اندریں صورت حضور نبی اکرم ﷺ نے تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے جہاد پر آمادگی کی بیعت لی، جسے 'بیعتِ رِضوان' کہا جاتا ہے۔ اِس کا ذکر قرآن حکیم میں یوں آتا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ط يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ۔[1]

''(اے حبیب!) بیشک جو لوگ آپ سے بیعت کرتے ہیں وہ اللہ ہی سے بیعت کرتے ہیں، ان کے ہاتھوں پر (آپ کے ہاتھ کی صورت میں) اللہ کا ہاتھ ہے۔''

حضور نبی اکرم ﷺ کے دستِ اقدس کو اللہ تعالیٰ نے اپنا ہاتھ اور آپ اسے بیعت کو اپنی بیعت قرار دیا۔ جب تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بیعت ہو چکی تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

إن عثمان فی حاجة اللّٰه تعالٰی وحاجة رسوله، فضرب بأحدی یدیه علی الأخری، فکانت ید رسول اللّٰہ لعثمان خیرا من أیدیهم لأنفسهم۔[2]

''(اے اللہ!) عثمان تیرے اور تیرے رسول کے کام میں مصروف ہے پس آپ ﷺ نے اپنا ایک ہاتھ دوسرے پر رکھا اور اپنے ہی ہاتھ کو عثمان رضی اللہ عنہ کا ہاتھ قرار دیتے ہوئے ان کی طرف سے بیعت لی۔ پس حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے لیے حضور ﷺ کا ہاتھ دیگر تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لیے ان کے اپنے ہاتھوں سے بہتر تھا۔''

---

(۱) الفتح، ۴۸: ۱۰

(۲) ترمذی، الجامع الصحیح، کتاب المناقب، باب فی مناقب عثمان بن عفان، ۵: ۶۳۶، رقم: ۳۷۰۲

یہ پہلو قابلِ غور ہے کہ اِدھر حضور رحمتِ عالم ﷺ نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ کو اپنا ہاتھ قرار دیا جبکہ دوسری طرف ﴿یَدُ اللهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ ''(گویا) اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے''﴾ کے مطابق حضور نبی اکرم ﷺ کے ہاتھ کو اللہ تعالیٰ نے اپنا ہاتھ قرار دیا گویا بالواسطہ عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ کو اللہ تعالیٰ نے اپنا دستِ قدرت قرار دیا، لہٰذا اس ہاتھ سے جمع و تدوینِ قرآن کے کام کا انجام پانا وعدہ اِلٰہی - ﴿اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْآنَهٗ ''بے شک اِس (قرآن) کا جمع کرنا اور پڑھانا ہمارے ذمہ ہے''﴾ - کے مطابق خود اللہ تعالیٰ کے دستِ قدرت سے ہی انجام پانا ہے۔

باری تعالیٰ نے ﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَo ''بیشک ہم نے اِس ذکر کو نازل فرمایا ہے اور ہم ہی اِس کی حفاظت فرمانے والے ہیں''﴾ کے اَلفاظ کی صورت میں وعدہ ٔ حفاظت قرآن کے سوا کسی اور الہامی کتاب یا صحیفے کے حق میں نہیں فرمایا۔ یہی وجہ ہے کہ بائبل کی جمع و تدوین کی پوری تاریخ رد و بدل، حذف واضافہ اور تحریف وترمیم کی تاریخ ہے۔ دوسری صدی عیسوی سے لے کر سترھویں صدی عیسوی تک عہد نامہ ٔجدید (New Testament) میں کئی حصوں کو پادریوں کے حسبِ منشاء اور مختلف کونسلز (Councils) کے فیصلوں کے مطابق کبھی داخل کیا جاتا رہا اور کبھی نکالا جاتا رہا۔ برنباس اور کئی کتابیں جن کا مجموعہ ۱۶۷۲ء میں اپوسٹالک فادرز (Apostolic Fathers) کے نام سے شائع ہوا تھا، ایسی تھیں جنہیں عیسائیت کے اوائل دور میں نہایت مقبولیت حاصل رہی لیکن بعد میں انہیں بائبل میں سے محض اِس لئے خارج کر دیا گیا کہ ان کی تعلیمات سینٹ پال کی خودساختہ عیسائیت کے باطل عقائد کے خلاف تھیں۔ اِسی طرح اپوکریفا (Apocrypha) اس عیسائی لٹریچر کا مجموعہ ہے جسے عیسائی پادریوں نے اپنے مذہبی مفادات کے خلاف تصور کرتے ہوئے چھپا دیا لیکن اِن کا وجود دنیا سے اب تک ختم نہیں ہو سکا۔

سب سے پہلی مکمل بائبل گوٹن برگ (Guten Burg) کے مطبع سے ۱۴۵۵ء

میں ولگیٹ (Vulgate) کے نام سے چھپی جس کے خلاف ۱۶ ویں صدی کے اوائل میں پروٹسٹینٹ اِصلاحی تحریک کے ساتھ اِعتراضات وتنقیدات کا دروازہ کھل گیا۔ الغرض ۱۵۴۶ء میں Council of Trent کے ذریعے اسے حتمی شکل دی گئی اور بالآخر رومن چرچ نے اسے بائبل کے مستند نسخے کے طور پر اپنا لیا لیکن حیرت کی بات ہے کہ اس میں پھر ردّ و بدل کی ضرورت محسوس کی گئی اور Pope Sixtus V نے ضروری ترمیمات و تصحیحات کے ذریعے یونیورسٹی آف پیرس کے متن کی صورت میں ۱۵۹۰ء میں شائع کیا۔

یہ مختصر تاریخی خاکہ تمثیلاً اس لئے پیش کیا گیا ہے کہ اس کے تناظر میں قرآن کی حفاظت اور کاملیت و تمامیت کا جائزہ لیا جا سکے کہ دوسری الہامی کتابوں کے اِرتقائی اَحوال کیا ہیں اور وہ کس طرح ہمیشہ ناقص و ناتمام رہی ہیں اور ان کے برعکس قرآن کا عالم کیا ہے کہ وہ ابتدائی دور سے لے کر آج تک اپنے متن اور عبارت کے لحاظ سے کامل و مکمل رہا ہے۔ اس میں آج تک کسی لفظ یا آیت کی کمی کی گئی اور نہ کسی شے کا اضافہ۔ یہ جس حالت میں پیغمبرِ اسلام ﷺ نے اُمت کو عطا کیا تھا آج تک اُسی حالت میں بغیر کسی تغیّر و تبدّل کے محفوظ ہے۔ حضور نبی اکرم ﷺ اللہ کے آخری نبی ہیں اور شریعت محمدی ﷺ قیامت تک کے لئے ہے، اس لئے رسولِ آخر ﷺ پر نازل ہونے والی کتاب کو بھی قیامت تک کے لئے محفوظ کر دیا گیا۔ اِعجازِ قرآن کا تسلسل قیامت تک جاری و ساری رہے گا۔ شریعتِ محمدی ﷺ کے نفاذ کے بعد تمام سابقہ شریعتوں کو منسوخ کر دیا گیا تھا اس لئے انبیائے سابق پر نازل ہونے والے اِلہامی صحیفوں کی حفاظت کی ضرورت بھی نہ تھی۔

یہ اسی حفاظت الٰہیہ کا کرشمہ ہے کہ ۱٫۴۰۰ سال گزر جانے کے باوجود آج تک قرآن میں ایک آیت، ایک لفظ یا ایک حرف کی حد تک بھی کمی بیشی نہیں ہوسکی۔ آج بھی بعض علاقوں میں ہزار بارہ سو سال پرانے کلامِ مجید کے نسخے موجود و محفوظ ہیں لیکن ان میں اور آج کے مطبوعہ نسخوں میں زیر زبر تک کا فرق نظر نہیں آتا۔

(۳) عدمِ اِختلاف و تناقض

قرآن اپنی معجز بیانی پر ایک دلیل یہ بھی پیش کرتا ہے کہ وہ اختلاف و تناقض سے مبرا ہے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ○[1]

”اور اگر یہ (قرآن) غیرِ خدا کی طرف سے آیا (ہوتا) تو یہ لوگ اس میں بہت سا اختلاف پاتے ○“

عام مصنفین کی تالیفات سے قطع نظر دیگر مذاہب کی الہامی کتابوں پر بھی نظر ڈالیں تو آپ کو لاتعداد تضادات ملیں گے جن میں تطبیق کرنا ممکن نہیں۔ مضامین کا اختلاف، ناموں اور نسبوں کا اختلاف، واقعات کا اختلاف، لشکر کی تعداد کا اختلاف، بیانات کا اختلاف، سنین و اوقات کا اختلاف، الغرض اجمال و تفصیل میں ہر جگہ مضحکہ خیز حد تک تضادات اور تناقضات ہیں جن کا جواب آج تک اس مذہب کے پیروکار نہیں دے سکے اور نہ ایسی کتابوں کو موضوع یا محرف ماننے کو ہی تیار ہیں۔ مذکورہ بالا حقیقت کا مشاہدہ بائبل کے تنقیدی و تقابلی مطالعہ سے بآسانی ہو سکتا ہے۔ انسائیکلو پیڈیا امیریکانا (Encyclopaedia Americana) میں بائبل (Bible) کے مضمون کے تحت اس امر کا اعتراف کیا گیا ہے کہ اس کے مختلف نسخہ جات میں کم و بیش تیس ۳۰ ہزار اغلاط موجود ہیں۔ اسی طرح Fred Glad Stonb Bratton نے History of Bible (مطبوعہ بوسٹن USA) کے صفحہ ۵ پر اس حقیقت کو بصراحت تسلیم کرلیا ہے کہ بائبل کے اندر واقعاتی اغلاط، غیرسائنسی نظریات، خدا اور انسان کی نسبت ناپاک تصورات، تضادات وتناقضات، نامعقول بیانات، مبالغہ آمیزیاں اور ناپختہ خیالات کثرت کے ساتھ موجود ہیں لیکن اس کے برعکس قرآن اول سے آخر تک ہر قسم کے اختلاف اور تناقض سے پاک ہے

---

(۱) النساء، ۴: ۸۲

بلکہ ہر آیت دوسری کی مؤید اور ہر مقام دوسرے کا مصدِّق ہے:

آفتابِ آمد دلیل آفتاب
گر دلیلے بایدت از وی رو متاب

قرآن حکیم میں ایک واقعہ بعض اوقات متعدد جگہ بیان ہوا ہے۔ ہر مقام پر اندازِ بیان اورسیاق و سباق مختلف ہونے کے باوجود اس کی واقعیت میں کوئی خفیف سا اختلاف اور تضاد نظر نہیں آتا۔ اس امر کی صحیح اہمیت کا اندازہ اس صورت حال کو سامنے رکھ کر ہوسکتا ہے کہ قرآن دیگر کتابوں کی طرح تصنیف نہیں ہوا بلکہ ۲۳ سال کے عرصہ میں اس کا نزول کبھی دن کو، کبھی رات کو، کبھی سفر میں، کبھی حضر میں، کبھی گھر اور کبھی میدان جنگ میں ہوتا رہا اور ہمیشہ حسبِ ضرورت اس کی چند آیات جن کی تعداد بالعموم تین سے دس تک ہوتی تھی نازل ہوتیں۔ آپ ذرا غور فرمایئے کہ اس طرح آیات کا تدریجی نزول تقریباً ۲۳ سال کے عرصہ کو محیط ہے۔ اس عرصہ میں متغیر حالات وقوع پذیر ہوتے رہے اور قرآن کبھی اس دوران ایک جلد کی صورت میں مرتب بھی نہ ہوسکا بلکہ لوگ اپنے طور پر کاغذوں، کپڑوں، پتھروں اور ہڈیوں کے ٹکڑوں پر لکھ کر محفوظ کرتے رہے۔ اس انداز سے اس کا نزول اور جمع و تدوین عمل میں آیا پھر بھی یہ ہر قسم کے اختلاف سے یکسر پاک رہا جو اس کے منزل من اللہ اور مبنی برحق ہونے کی دلیل ہے!

(۴) ندرتِ اُسلوب و نظمِ کلام

عہدِ نزولِ قرآن تک عربوں میں قصائد، مکتوبات، خطابات اور محاورات کے صرف چار معروف اسالیب متداول تھے، وہ کسی اور اسلوبِ بیان سے واقف ہی نہ تھے۔ ان معینہ اور معلومہ اسالیب سے مختلف ایک نیا اسلوب بیان پیدا کرلینا قرآن حکیم ہی کا ایک اعجاز تھا۔

قرآن کی ندرت کا اسلوب اور منفرد انداز آج تک کسی اور ادب میں پیدا نہیں ہو سکا۔ عام کتابیں ابواب وفصول پر مشتمل ہوتی ہیں لیکن قرآن ایسی کسی تبویب و تفصیل سے پاک ہے اور نہ اس کے مختلف مضامین کو الگ الگ عنوانات کے تحت بیان کیا گیا ہے۔ قرآن کے اسلوبِ بیان اور نظمِ کلام میں ایک جُوئے آبِ رو کا سا تسلسل اور روانی ہے، کسی جگہ پر انقطاع نظر نہیں آتا۔ قرآن نے اپنی بعض سورتوں کو حمد وثنا سے شروع کیا اور بیان کی وضاحت کی غرض سے، بعض کا اختتام جامع کلمات پر کیا اور بعض کا نصیحتوں پر، کبھی وعدہ اور کبھی تبشیر کا انداز اپنایا، کبھی تہدید کی، کبھی تاکید، کبھی مخلوق کا بیان کیا، کبھی خالق کا، کبھی کائنات کی نشانیاں بیان کیں، کبھی انبیاء اور اُممِ سابقہ کے قصص اور واقعات، کبھی حلت و حرمت کے احکام دیئے کبھی استثناء و رخصت کے، کبھی احقاقِ حق کیا کبھی ابطالِ باطل، کہیں مخاصمہ کا رنگ اپنایا کہیں موعظت کا، کہیں انبیاء و مرسلین کی تعلیمات و خدمات بیان کیں، کہیں ان کی عظمتوں اور رفعتوں کا ذکر کیا، کہیں خطاب ہے کہیں غیاب اور کہیں تکلم، اندازِ کلام بغیر تکلف کے بڑی بے ساختگی سے بدلتا رہتا ہے لیکن حلاوت اور دلکشی برقرار رہتی ہے اور آیات کا ربط کہیں متاثر نہیں ہوتا۔ قرآن کے اُسلوبِ بیان اور نظمِ کلام کے سلسلے میں مزید دو اُمور قابل توجہ ہیں:

الف۔ انتشارِ مطالب

ب۔ تکرارِ مضامین

قرآنی علوم اور معارف و مطالب عام طور پر پانچ انواع پر مشتمل ہیں:

علم الأحکام، علم المخاصمة، علم التذکیر بآلاء الله، علم التذکیر بأیام الله وعلم التذکیر بالموت۔ (۱)

الف۔ قرآنی اسلوب میں انتشارِ مطالب کا معنی یہ ہے کہ قرآن اس امر کی رعایت

(۱) شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، الفوز الکبیر: ۱

نہیں کرتا کہ اس سورت میں صرف فلاں نوع کا علم ذکر کیا جائے گا اور دوسری سورت میں فلاں نوع کا بلکہ اس کی ایک ہی سورت میں متعدد انواع کے مطالب و معارف بیان کرتا چلا جاتا ہے۔ ایک علم کے ساتھ متصلاً دوسرا علم بیان کرنا کسی دوسری کتاب میں تو یقیناً مذاقِ لطیف پر گراں گزرتا ہوگا لیکن قرآنی اعجاز کا یہ عالم ہے کہ بدلتے ہوئے مضامین و مطالب کے باوجود بیان اور تفہیم میں بے ساختہ روانی اور لطافت برقرار رہتی ہے۔ یہاں تک کہ کسی کو یہ محسوس بھی نہیں ہوتا کہ اب روئے سخن بدل گیا ہے۔ بات بغیر کسی تکلیف اور تکلف کے دل میں اترتی چلی جاتی ہے۔ جیسے سورۃ الکوثر پر نظر ڈالیے:

اِنَّا اَعۡطَیۡنٰکَ الۡکَوۡثَرَ ○ فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَ انۡحَرۡ ○ اِنَّ شَانِئَکَ هُوَ الۡاَبۡتَرُ ○ (۱)

’’بیشک ہم نے آپ کو (ہر خیر وفضیلت میں) بے انتہاء کثرت بخشی ہے ○ پس آپ اپنے رب کے لئے نماز پڑھا کریں اور قربانی دیا کریں (یہ ہدیۂ تشکر ہے) ○ بیشک آپ کا دشمن ہی بے نسل اور بے نام و نشان ہوگا ○‘‘

اس مختصر سی سورت کی تین آیتوں میں چار جملے ہیں۔ تینوں آیتوں میں احکام مختلف ہیں، لیکن ایک دوسرے سے معنوی اعتبار سے پیوست اور مربوط معلوم ہوتے ہیں۔ چاروں جملوں میں الگ الگ اور اپنی اپنی جگہ مستقل معانی و مطالب بیان کئے گئے ہیں۔ سب سے پہلے عطائے نعمت کا بیان ہے پھر حکمِ عبادت ہے، آخر میں مخالفوں کے لیے چیلنج ہے بلکہ پیشین گوئی بھی ہے گویا انتشارِ مطالب میں بھی معنوی اتحاد اور تسلسل کی کیفیت ابھرتی نظر آتی ہے۔

ب۔ تکرارِ مضامین میں حکمت و مصلحت یہ ہے کہ بعض اوقات صرف ایک حقیقت سے دوسرے کو آگاہ کرنا مقصود ہوتا ہے، اور بعض اوقات اسے سامع کے دل میں جاگزیں

---

(۱) الکوثر، ۱۰۸: ۱۔۳

کرنا مطلوب ہوتا ہے: پہلے مقصد کے لیے تو صرف ایک مرتبہ کا بیان کافی رہتا ہے لیکن دوسرے مقصد کے لیے بات کو بار بار مختلف انداز سے بیان کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اس نوع کے مضامین کے لیے قرآن کے پیشِ نظر ایک خاص مقصدِ تخاطب ہوتا ہے چنانچہ ایک ہی مضمون بار بار بیان ہوا لیکن ہر دفعہ نئی حکمت و موعظت کے ساتھ اس کی کئی پرتیں کھلتی چلی گئیں؛ مثلاً سورۃ الشعراء میں ﴿اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃًط وَمَا کَانَ اَکْثَرُھُمْ مُّؤْمِنِیْنَo وَاِنَّ رَبَّکَ لَھُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُo﴾(۱) آٹھ بار آیا ہے، سورۃ القمر میں ﴿وَلَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّکْرِ فَھَلْ مِنْ مُّدَّکِرٍo﴾(۲) چار مرتبہ آیا ہے، سورۃ المرسلات میں ﴿وَیْلٌ یَّوْمَئِذٍ لِّلْمُکَذِّبِیْنَo﴾(۳) دس بار آیا ہے، سورۃ الرحمان میں ﴿فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِo﴾(۴) اکتیس مرتبہ آیا ہے لیکن ہر جگہ نہ صرف ایک نیا لطف اور منفرد کیفیت نصیب ہوتی ہے بلکہ اس تکرار سے دل و دماغ پر اکتاہٹ کی بجائے ہر بار نئے معانی و غوامض اور اسرار و رموز منکشف ہوتے ہیں۔

(۵) فصاحت و بلاغت

قرآن کا اسلوب سادگی اور سلاست کے علاوہ فصاحت و بلاغت کے اس اعلیٰ مقام پر فائز ہے جس کا معارضہ آج تک بڑے بڑے فصحاء و بلغاء نہیں کر سکے۔ اس میں مقتضائے حال کی رعایت، استعارہ و کنایہ اور صنائع و بدائع کا استعمال ناقابلِ بیان حسن اور ادبی چاشنی پیدا کرنے کا موجب بنتا ہے۔

(۱) الشعراء، ۲۶: ۹، ۶۸، ۱۰۴، ۱۲۲، ۱۴۰، ۱۵۹، ۱۷۵، ۱۹۱

(۲) القمر، ۵۴: ۱۷، ۲۲، ۳۲، ۴۰

(۳) المرسلات، ۷۷: ۱۵، ۱۹، ۲۴، ۲۸، ۳۴، ۳۷، ۴۰، ۴۵، ۴۷، ۴۹

(۴) الرحمن، ۵۵: ۱۳، ۱۶، ۱۸، ۲۱، ۲۳، ۲۵، ۲۸، ۳۰، ۳۲، ۳۴، ۳۶، ۳۸، ۴۰، ۴۲، ۴۵، ۴۷، ۴۹، ۵۱، ۵۳، ۵۵، ۵۷، ۵۹، ۶۱، ۶۳، ۶۵، ۶۷، ۶۹، ۷۱، ۷۳، ۷۵، ۷۷

علامہ کرمانی اپنی کتاب ''العجائب'' میں لکھتے ہیں کہ معاندینِ اسلام نے عرب وعجم کے تمام کلام ڈھونڈ مارے مگر کوئی کلام بھی حسنِ نظم، جودتِ معانی، فصاحتِ الفاظ اور ایجاز میں اس کی مثل نہ ملا اورانہیں بالآخر اس امر پر متفق ہونا پڑا کہ انسانی طاقت قرآن کی آیت کی مثل لانے سے قاصر ہے۔

قرآن کی فصاحت وبلاغت کا یہ اعجاز ہے کہ دنیائے عرب کے ادبی شاہکار 'سبع معلقات' - سات اساتذہ کے لاجواب قصائد وغزلات - جو خانہ کعبہ کے دروازے پر آویزاں تھے، نزولِ قرآن کے بعد اس لئے اتار لیے گئے کہ قرآنی فصاحت و بلاغت کا کوئی شے بھی معارضہ نہیں کرسکتی۔ فصاحت قرآنی کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

ا۔ مجاز و کنایہ

۱۔ نِسَآؤُکُمْ حَرْثٌ لَّکُمْ فَاْتُوْا حَرْثَکُمْ اَنّٰی شِئْتُمْ۔[۱]

''تمہاری عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں، پس تم اپنی کھیتیوں میں جیسے چاہو آؤ۔''

۲۔ ھُنَّ لِبَاسٌ لَّکُمْ وَ اَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّھُنَّ۔[۲]

''وہ تمہاری پوشاک ہیں اورتم ان کی پوشاک ہو۔''

۳۔ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ۔[۳]

''یا تم نے (اپنی) عورتوں سے مباشرت کی ہو۔''

مذکورہ بالا آیات میں بیان کی بے ساختگی اوراظہار کی بے تکلفی بھی ہےاور کمال درجہ حیاء وشرافت کی آئینہ داری بھی۔ اشاروں کنایوں میں نہایت حسن و خوبی کے ساتھ ایسے مضامین اور احکام و مسائل بیان کر دیئے گئے ہیں کہ کوئی بڑے سے بڑا ادیب اشارت اورصراحت کے ایسے خوبصورت امتزاج سے بیان نہیں کرسکتا۔

(۱) البقرہ، ۲: ۲۲۳

(۲) البقرہ، ۲: ۱۸۷

(۳) النساء، ۴: ۴۳

ب۔ تشبیہ و استعارہ

۱۔ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ۔[۱]

’’اس کے نور کی مثال (جو نورِ محمدی کی شکل میں دنیا میں روشن ہوا) اس طاق (نما سینۂ اقدس) جیسی ہے جس میں چراغ (نبوت روشن) ہے۔‘‘

۲۔ كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا۔[۲]

’’گدھے کی مِثل ہے جو پیٹھ پر بڑی بڑی کتابیں لادے ہوئے ہو۔‘‘

یہاں علم سے صحیح فائدہ نہ اٹھانے والوں کی کیفیت کس قدر خوبصورت انداز میں بیان کی گئی ہے۔

۳۔ وَالَّيْلِ اِذَا عَسْعَسَ○ وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ○[۳]

’’اور رات کی قسم جب اس کی تاریکی جانے لگے○ اور صبح کی قسم جب اس کی روشنی آنے لگے○‘‘

ان دو آیات میں رات کے دھیرے دھیرے رخصت ہونے اور صبح کے رفتہ رفتہ آنے کا ذکر جس دلکش جمالیاتی انداز میں کیا گیا ہے وہ ادبی چاشنی میں اپنی مثال آپ ہے۔

اِسی طرح ایجاز کی مثال ملاحظہ ہو:

۴۔ وَلَكُمْ فِى الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ۔[۴]

(۱) النور، ۲۴: ۳۵

(۲) الجمعہ، ۶۲: ۵

(۳) التکویر، ۸۱: ۱۷، ۱۸

(۴) البقرہ، ۲: ۱۷۹

’’تمہارے لئے قصاص (یعنی خون کا بدلہ لینے) میں ہی زندگی (کی ضمانت) ہے۔‘‘

امام سیوطی نے ’’الاتقان‘‘ میں لکھا ہے کہ اس آیت میں ۲۰ صنعتیں بیان ہوئی ہیں۔

(٦) صوتی حسن و ترنم

قرآن حکیم کی ہر آیت اور اس کے مطلع و مقطع میں ایک خاص قسم کا صوتی حسن و جمال پایا جاتا ہے۔ یہ معنوی نغمگی اور باطنی موسیقیت شعری اوزان وقوافی سے مبرا ہونے کے باوجود جمالیاتی اہتزاز و بالیدگی کا احساس دلاتی ہے۔ قرآن کی سحر بیانی کافی حد تک اس حسن صوتی پر منحصر ہے۔ اس اعتبار سے قرآنی سورتیں تین (۳) اَقسام پر منقسم ہیں: ’طویل‘ مثلاً سورۃ النساء، ’متوسط‘ مثلاً سورۃ الاعراف اور الانعام، اور ’قصیر‘ مثلاً سورۃ الشعراء اور الدخان۔ صوتی ترنم کی یہ کیفیت ہر شخص کے لئے عجیب لطف و شگفتگی کا سامان پیدا کر دیتی ہے۔ اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

۱۔ نٓ وَ الْقَلَمِ وَ مَا یَسْطُرُوْنَ۔(۱)

۲۔ وَالْمُرْسَلَاتِ عُرْفًا ○ فَالْعَاصِفَاتِ عَصْفًا ○ وَّالنَّاشِرَاتِ نَشْرًا ○ فَالْفَارِقَاتِ فَرْقًا○ فَالْمُلْقِيَاتِ ذِكْرًا○ عُذْرًا اَوْ نُذْرًا○(۲)

۳۔ فَاِذَا النُّجُوْمُ طُمِسَتْ○ وَ اِذَا السَّمَآءُ فُرِجَتْ○ وَ اِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ○ وَ اِذَا الرُّسُلُ اُقِّتَتْ ○لِاَیِّ یَوْمٍ اُجِّلَتْ○(۳)

۴۔ وُجُوْهٌ یَّوْمَئِذٍ نَاعِمَةٌ○ لِّسَعْیِهَا رَاضِیَةٌ○ فِیْ جَنَّةٍ عَالِیَةٍ○ لَّا تَسْمَعُ

(۱) القلم، ٦٨: ۱

(۲) المرسلات، ۷۷: ۱۔٦

(۳) المرسلات، ۷۷: ۸۔ ۱۲

فِيْهَا لَاغِيَةًo فِيْهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌo[۱]

۵۔ وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَاo وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَاo وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰهَاo وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰهَاo وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنَاهَاo وَالْاَرْضِ وَمَا طَحَاهَاo وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَاo فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَاo قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَاo وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَاo[۲]

۶۔ اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَاo وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَاo وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَالَهَاo[۳]

۷۔ فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًاo فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًاo[۴]

مذکورہ بالا آیات میں سے ہر ایک کا اختتامی لفظ ایک خاص صوتی نغمگی پیدا کر رہا ہے۔ الفاظ کا چناؤ اور وزن، ان کا آپس میں ربط، جوڑ اور ترکیب، پھر ان میں تلفظ کی سلاست اور بہاؤ ایک عجیب موسیقیت اور موزونیت کی فضا پیدا کرتا ہے۔ ان آیات کو بار بار پڑھیں، سادگی سے پڑھیں یا مترنم انداز میں زبان میں رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی اور ہر لمحہ عجیب سی حلاوت کا یک گونہ احساس ہونے لگتا ہے۔ مستزاد یہ کہ اگر مذاقِ سلیم اور حسِ لطیف ہو تو ان آیات کے صوتی آہنگ سے ہی کسی حد تک معنی و مفہوم کی ترجمانی ہونے لگتی ہے مثلاً سورۃ الناس کو بار بار پڑھیں تو ہر آیت کا آخری حرف 'س' نرمی، پستی، سیٹی کی آواز کثرت استعمال کے باعث سرگوشی کی فضا پیدا کر دیتا ہے۔ یہی سرگوشی اور وسوسہ اندازی اس سورت کا بنیادی موضوع ہے۔

(۱) الغاشیہ، ۸۸:۸۔۱۲

(۲) الشمس، ۹۱: ۱۔۱۰

(۳) الزلزال، ۹۹: ۱۔ ۳

(۴) العادیات، ۱۰۰: ۴، ۵

(۷) اَحوالِ غیب کا بیان

قرآن حکیم کے اعجازِ بیان کا ایک بہت بڑا ثبوت اس میں احوال غیبی کا بیان ہے۔ قرآن مجید نے اپنی اس حیثیت کو خود اپنے لفظوں میں اس طرح واضح کیا ہے:

ذٰلِکَ مِنۡ اَنۡبَآءِ الۡغَیۡبِ نُوۡحِیۡهِ اِلَیۡکَ۔(۱)

’’(اے محبوب!) یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم آپ کی طرف وحی فرماتے ہیں۔‘‘

ایک اور مقام پر اس کی تصریح کرتے ہوئے فرمایا:

تِلۡکَ مِنۡ اَنۡبَآءِ الۡغَیۡبِ نُوۡحِیۡهَاۤ اِلَیۡکَج مَا کُنۡتَ تَعۡلَمُهَاۤ اَنۡتَ وَلَا قَوۡمُکَ مِنۡ قَبۡلِ هٰذَا۔(۲)

’’یہ (بیان ان) غیب کی خبروں میں سے ہے جو ہم آپ کی طرف وحی کرتے ہیں۔ اس سے قبل نہ آپ انہیں جانتے تھے اور نہ آپ کی قوم۔‘‘

قرآنی اعجاز کا یہ پہلو خود حضور نبی اکرم ﷺ کے معجزات سے نمایاں ہوا۔ حضور نبی اکرم ﷺ کبھی علومِ غیب کے بیان میں بخل نہیں کرتے تھے۔ سائل جس قسم کا بھی سوال لے کر آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتا، تسلی بخش جواب پا کر جاتا تھا۔ حضور نبی اکرم ﷺ کے ہمہ جہت علم کے اس گوشے کا ذکر قرآن حکیم یوں کرتا ہے:

وَمَا هُوَ عَلَی الۡغَیۡبِ بِضَنِیۡنٍ ○(۳)

’’اور وہ (نبی مکرم ﷺ) غیب (کے بتانے) پر بالکل بخیل نہیں ہیں (مالکِ عرش نے ان کے لئے کوئی کمی نہیں چھوڑی)○‘‘

---

(۱) آل عمران، ۳: ۴۴

(۲) ہود، ۱۱: ۴۹

(۳) التکویر، ۸۱: ۲۴

قرآن حکیم میں احوالِ غیب کا بیان کئی اعتبارات سے آیا ہے لیکن یہاں وضاحت کے لئے صرف دو کا ذکر کیا جاتا ہے:

الف۔ اُممِ سابقہ کے احوال و واقعات

ب۔ مستقبل کی پیشین گوئیاں

ا۔ اُممِ سابقہ کے اَحوال و واقعات

قرآنِ حکیم نے اُمَمِ سابقہ اور گزشتہ انبیاء کے حوالے سے بہت سے واقعات وحالات بیان کئے ہیں جن میں سے کئی ایک کا ذکر پہلی کتابوں میں سرے سے موجود ہی نہ تھا اور بعض کا ذکر پہلی کتابوں میں ہے لیکن وہ اس قدر محرف ومتبدل صورت میں ہے کہ اس کی صحت کے بارے میں کسی کے پاس کوئی یقینی شہادت موجود نہیں۔ قرآن نے ان احوال وواقعات اور انبیاء کی تعلیمات وخدمات کو سند تصدیق عطا کر دی اس لئے اس کا لقب مُصَدِّقُ الَّذِیْ بَیْنَ یَدَیْهِ (اپنے سے پہلے کی تصدیق کرنے والا) قرار پایا۔

قرآن مجید نے کئی مقامات پر حضرت آدم وحوا علیہما السلام، نوح علیہ السلام، ابراہیم علیہ السلام، اسحاق علیہ السلام، اسماعیل علیہ السلام، یعقوب علیہ السلام، یوسف علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام، خضر علیہ السلام، سلیمان علیہ السلام، داؤد علیہ السلام، یونس علیہ السلام، ذوالکفل علیہ السلام، صالح علیہ السلام، شعیب علیہ السلام، زکریا علیہ السلام، یحییٰ علیہ السلام، عیسیٰ و مریم علیہما السلام اور اَصحابِ کہف وغیرہم کے حالات کا بیان ہے۔ یہ سب علوم غیبیہ ہیں۔

ان کے علاوہ قومِ ہود، قومِ عاد، قومِ ثمود، قومِ لوط اور دیگر اقوام وملل کا ذکر تذکیر بایام اللہ کے انداز میں کیا گیا ہے۔ اسی طرح فرعون، نمرود، قارون اور ہامان وغیرہم کے احوال کا عبرت انگیز بیان ہے۔ ان کے علاوہ بھی قرآن حکیم میں اسی قبیل کے متعدد واقعات مذکور ہیں۔

ب۔ مستقبل کی پیشین گوئیاں

اعجازِ قرآن کے داخلی دلائل میں سے یہ دلیل بھی بہت مؤثر اور فیصلہ کن ہے کہ قرآن نے بعض پیشین گوئیاں ایسے حالات میں کیں جن میں ظاہراً ان کے وقوع پذیر ہونے کا کوئی امکان دور دور تک نظر نہیں آ رہا تھا۔ مخالفینِ قرآن وہ پیشین گوئیاں سن کر حیران و ششدر رہ گئے لیکن تاریخ شاہد ہے کہ دیکھتے ہی دیکھتے وہ پیشین گوئیاں اپنے اپنے وقت پر حقائق و وقائع کے قالب میں ڈھلتی چلی گئیں۔ یہ سب کچھ اب تاریخ کا ناقابل تردید حصہ بن چکا ہے جو زبانِ حال سے قرآن کی صداقت وحقانیت کا اعلان کر رہا ہے۔ ذیل میں چند قرآنی پیشین گوئیاں بیان کی جاتی ہیں:

i. غلبۂ روم کی پیشین گوئی

یہ پیشین گوئی سب سے نمایاں اور حیرت انگیز ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

الٓمّٓ ○ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ○ فِیْٓ اَدْنَی الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْم بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ○ فِیْ بِضْعِ سِنِيْنَ ط لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَ مِنْم بَعْدُ۔[1]

’الف لام میم (حقیقی معنی اللہ اور رسول ﷺ ہی بہتر جانتے ہیں)○ اہلِ روم (فارس سے) مغلوب ہو گئے○ نزدیک کے ملک میں، اور وہ اپنے مغلوب ہونے کے بعد عنقریب غالب ہو جائیں گے ○ چند ہی سال میں (یعنی دس سال سے کم عرصہ میں)، امر تو اللہ ہی کا ہے پہلے (غلبۂ فارس میں) بھی اور بعد (کے غلبۂ روم میں) بھی۔‘‘

اس پیشین گوئی کے اعلان یعنی رومیوں کے آغاز شکست سے ٹھیک آٹھ برس

(۱) الروم، ۳۰: ۱۔۴

بعد ۶۲۲ء میں رومیوں کے تن مردہ میں پھر حیاتِ نو پیدا ہوگئی۔ وہ اسی کا اہل وعشرت پرست کمانڈر ہرقل کے زیر قیادت منظّم ہو کر ایرانیوں پر حملہ آور ہوئے۔ ۶۲۳ء میں یعنی پیشین گوئی کے ٹھیک نویں برس رومی فتح و کامرانی سے ہمکنار ہوئے۔ بالآخر یہ فتح اس شان سے پایۂ تکمیل کو پہنچی کہ انہوں نے مشرقی مقبوضات کا ایک ایک شہر واپس لے لیا اور ایرانیوں کو باسفورس اور نیل کے کناروں سے ہٹا کر پھر دجلہ وفرات کے ساحلوں تک دھکیل دیا۔ اس طرح قرآن کی پیشین گوئی کے حرف بہ حرف سچ ثابت ہونے پر بے شمار کافر مسلمان ہو گئے۔

ii. فتحِ مکہ کی پیشین گوئی

۶ ہجری میں جب مسلمان صلح حدیبیہ سے واپس لوٹے تو ان میں قدرے مایوسی پائی جاتی تھی۔ وہ اس صلح اور اس کی شرائط کو اپنے لئے شکست کا اعتراف سمجھ رہے تھے یہاں تک کہ بعض نے صاف لفظوں میں اس خیال کا اظہار بھی کر دیا تھا لیکن حضور ﷺ نے ان کے اطمینانِ قلب کے لئے قرآن مجید کی اس پیشین گوئی کا اعلان فرمایا:

اِنَّا فَتَحنَا لَکَ فَتحاً مُّبِیناً ○(۱)

”(اے حبیبِ مکرم!) بیشک ہم نے آپ کے لئے (اسلام کی) روشن فتح (اور غلبہ) کا فیصلہ فرما دیا (اس لئے کہ آپ کی عظیم جدّ و جہد کامیابی کے ساتھ مکمل ہو جائے)○“

اس آیت میں یہ اشارہ تھا کہ حدیبیہ کی صلح کو شکست نہ سمجھو بلکہ یہ درحقیقت پیش خیمہ ہے ایک عظیم الشان فتح کا، جو فتح مکہ کی صورت میں اہلِ ایمان کو حاصل ہونے والی ہے چنانچہ اسی سورت میں فرمایا گیا:

لَتَدخُلُنَّ المَسجِدَ الحَرَامَ اِن شَآءَ اللّٰہُ اٰمِنِینَ مُحَلِّقِینَ

(۱) الفتح، ۴۸: ۱

رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ لَا تَخَافُوْنَ۔[۱]

’’بیشک اللہ نے اپنے رسول (ﷺ) کوحقیقت کے عین مطابق سچا خواب دکھایا تھا کہ تم لوگ، اگر اللہ نے چاہا تو ضرور بالضرور مسجد حرام میں داخل ہوگے امن و امان کے ساتھ، (کچھ) اپنے سر منڈوائے ہوئے اور (کچھ) بال کتروائے ہوئے (اس حال میں کہ) تم خوفزدہ نہیں ہوگے۔‘‘

بالآخر اس پیشین گوئی کا ظہور فتحِ مکہ کی صورت میں ۸ھ میں ہوا۔ اس طرح وہ جو صلحِ حدیبیہ کی بظاہر مایوس کن شرائط سے دل گرفتہ تھے اُنہوں نے اس صلح نامے سے حاصل ہونے والی کامیابی کو بدل و جاں تسلیم کر لیا۔ کفارِ مکہ اس معاہدے سے روگرداں ہو گئے جس کا خمیازہ انہیں کئی صورتوں میں بھگتنا پڑا۔

iii. فتحِ خیبر کی پیشین گوئی

غزوۂ خیبر کی فتح کے بارے میں بھی سورہ الفتح میں پیشین گوئی کرتے ہوئے قرآن مجید میں اِرشاد فرمایا گیا:

سَيَقُوْلُ الْمُخَلَّفُوْنَ اِذَا انْطَلَقْتُمْ اِلٰى مَغَانِمَ لِتَاْخُذُوْهَا ذَرُوْنَا نَتَّبِعْكُمْ۔[۲]

’’جب تم (خیبر کے) اموالِ غنیمت کو حاصل کرنے کی طرف چلو گے تو (سفرِ حدیبیہ میں) پیچھے رہ جانے والے لوگ کہیں گے ہمیں بھی اجازت دو کہ ہم تمہارے پیچھے ہو کر چلیں۔‘‘

یہاں جو لوگ حدیبیہ میں حضور نبی اکرم ﷺ کے ساتھ نہیں آئے تھے ان کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ صلحِ حدیبیہ سے واپس لوٹتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے از راہِ بشارت فتح خیبر کی

(۱) الفتح، ۴۸:۲۷

(۲) الفتح، ۴۸: ۱۵

پیشین گوئی بھی کر دی اور صراحت کے ساتھ مسلمانوں کو یہ بھی بتا دیا کہ غزوۂ خیبر میں تمہارے ہاتھ بہت سا مالِ غنیمت بھی آئے گا لیکن ہم نے وہ مالِ غنیمت صرف ان مجاہدین کے لئے مخصوص کر دیا ہے جو حدیبیہ کے موقع پر حضور نبی اکرم ﷺ کے ہمراہ ہیں۔ اس وقت ساتھ نہ دینے والے اس مالِ غنیمت سے بھی محروم رہیں گے۔ چنانچہ اس پیشین گوئی کی صداقت بھی تاریخِ عالم کے صفحات پر جلی حروف میں رقم ہوئی، خیبر فتح بھی ہوا اور بے شمار مالِ غنیمت بھی مسلمانوں کے ہاتھ لگا۔

iv. غلبۂ اِسلام کی پیشین گوئی

سب سے بڑھ کر حیرت انگیز وہ پیشین گوئی ہے جس میں مسلمانوں کو روئے زمین پر عظیم الشان تمکن واستخلاف اور اقتدار واستحکام کی خوشخبری سنائی گئی تھی، حالانکہ اس وقت روم وایران کی دو عظیم عالمی طاقتیں مشرق ومغرب پر اس طرح قابض ومتصرف تھیں، جس طرح بعد کی دُنیا میں امریکہ اور روس دو سپر طاقتوں کی شکل میں مسلّط تھے، جزیرہ نمائے عرب کے ان صحرا نشینوں کے بارے میں یہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا کہ اپنی بے سروسامانی کے عالم میں وہ بین الاقوامی سطح پر ایک عظیم اور مؤثر طاقت بن کر ابھرنے کا سوچ بھی سکتے تھے کیونکہ اس وقت یہ دونوں عالمی طاقتیں اس انقلابی قوم کو صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کرنے پر تلی ہوئی تھیں۔ اندریں حالات قرآن نے اس بشارت کا اعلان ان الفاظ میں کیا:

وَعَدَ اللهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْم بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا۔[۱]

’’اللہ نے ایسے لوگوں سے وعدہ فرمایا ہے (جس کا ایفا اور تعمیل اُمت پر لازم

(۱) النور، ۲۴: ۵۵

ہے) جو تم میں سے ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے وہ ضرور انہی کو زمین میں خلافت (یعنی امانتِ اقتدار کا حق) عطا فرمائے گا جیسا کہ ان لوگوں کو (حق) حکومت بخشا تھا جو ان سے پہلے تھے اور ان کے لئے ان کے دین (اسلام) کو جسے اس نے ان کے لئے پسند فرمایا ہے (غلبہ و اقتدار کے ذریعہ) مضبوط و مستحکم فرما دے گا اور وہ ضرور (اس تمکن کے باعث) ان کے پچھلے خوف کو (جو ان کی سیاسی، معاشی اور سماجی کمزوری کی وجہ سے تھا) ان کے لئے امن و حفاظت کی حالت سے بدل دے گا۔‘‘

چشمِ فلک نے اس پیشین گوئی کا عملی ظہور بھی مستقبل قریب میں دیکھ لیا۔ عہدِ رسالت مآب ﷺ میں اسلامی فتوحات کے جس سلسلے کا آغاز ہوا تھا، وہ عہدِ خلافتِ راشدہ میں اس قدر وسعت پکڑ گیا کہ روم اور ایران سمیت قریباً ۱۰ لاکھ مربع میل سے زائد رقبہ اسلامی سلطنت کے زیرِ نگین آ گیا۔ عہدِ فاروقی میں مسلمان اسلام کا آفاقی پیغام لے کر بلوچستان کی سرحدوں تک پہنچ چکے تھے، ابھی اسلام کی پہلی صدی ختم نہ ہوئی تھی کہ اسلامی سرحدیں سپین سے آگے فرانس تک پھیل چکی تھیں، مشرق میں سندھ اور ملتان تک، ماوراء النہر سے آگے چین، وسطی ایشیا، شمالی افریقہ تک اسلام کی روشنی پہنچ گئی اور دنیا کے کثیر ترین حصے پر پرچم اسلام لہرانے لگا۔ سطوت اسلام کا یہ پرشکوہ نظارہ قرآنی وعدے کے مطابق تقریباً چھ سو سال تک قائم و دائم رہا۔ زوالِ بغداد کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد پھر ترکوں کی زیرِ قیادت ملت اسلامیہ کی سیاسی قوت مجتمع ہوئی اور بالآخر بین الاقوامی سطح پر غلبہ اسلام کا دور پھر چھ سو سال تک منصۂ عالم پر شہود پذیر رہا۔

اس طرح کی پیشین گوئیاں جو قرآن نے بیان کیں وہ اپنے وقت پر عالمِ خارج میں واقعہ بن کر حقانیتِ قرآن کی حتمی دلیلیں بنیں، وہ تعداد میں اتنی ہیں کہ ان کا شمار آسانی سے نہیں کیا جا سکتا۔

(۸) نتیجہ خیزی کی ضمانت

قرآنی اعجاز کی دلیلِ ناطق اس کی ہدایت کا نتیجہ خیز ہونا ہے۔ قرآن مجید نے نہ صرف اپنی ہر دعوت کو حتمی، قطعی اور یقینی طور پر فیصلہ کن قرار دیا بلکہ معیارِ صداقت وحقانیت بھی نتیجہ خیزی ہی کو قرار دیا ہے۔ قرآن حکیم نے کامل یقین کے میسر آنے کی جس جس تدبیر کا ذکر کیا ہے وہ بہرصورت تجربی توثیق، مشاہدۂ حقیقت اور نتیجہ خیزی کے تصور پر مبنی ہے۔

قرآن میں نتیجہ خیزی کی ضمانت کا مفہوم یہی ہے کہ اس کے سلسلۂ علم وہدایت کا ہر دعویٰ تجربی توثیق کی بنا پر معروضی نتائج پیدا کرنے کا ضامن ہے جو فی نفسہٖ قرآن ہی کا اعجاز ہے۔ اس سلسلے میں چند ارشادات قرآنی ملاحظہ ہوں:

۱۔ قرآنی ہدایت کے نزول کا مقصد یہ تھا کہ انسانیت کو دنیا وآخرت میں خوف وغم کی مہیب کیفیت سے نجات دلا دی جائے۔ چنانچہ قرآن نے اپنے اس دعویٰ کی نتیجہ خیزی کا بیان اس طرح کیا:

فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّى هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَo(۱)

’’پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت پہنچے تو جو بھی میری ہدایت کی پیروی کرے گا نہ ان پر کوئی خوف (طاری) ہو گا اور نہ وہ غمگین ہوں گےo‘‘

۲۔ اسی طرح قرآن ﴿فَإِنَّ حِزْبَ اللهِ هُمُ الْغَالِبُوْنَ ’’بیشک اللہ کی جماعت (کے لوگ) ہی غالب ہونے والے ہیں﴾(۲) کا اعلان کر کے اس دنیا میں باطل کے مقابلے

(۱) البقرہ، ۲:۳۸

(۲) المائدۃ، ۵: ۵۶

میں غلبۂ دین کا دعویٰ کرتا ہے۔ یہ دعویٰ محض اس پر موقوف نہیں کہ مسلمان اس کی آرزو تو کرسکیں لیکن انہیں اس کی عملی اور واقعاتی نتیجہ خیزی کا مشاہدہ نہ ہو سکے چنانچہ اس امر کی ضمانت بھی ساتھ ہی مہیا کر دی گئی:

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَO(۱)

''اور تم ہمت نہ ہارو اور نہ غم کرو اور تم ہی غالب آؤ گے اگر تم (کامل) ایمان رکھتے ہوo''

۳۔ ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا گیا:

فَلَا تَهِنُوْا وَتَدْعُوْا اِلَى السَّلْمِ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ وَاللّٰهُ مَعَكُمْ وَلَنْ يَّتِرَكُمْ اَعْمَالَكُمْO(۲)

''(اے مومنو!) پس تم ہمت نہ ہارو اور ان (متحارب کافروں) سے صلح کی درخواست نہ کرو (کہیں تمہاری کمزوری ظاہر نہ ہو)، اور تم ہی غالب رہو گے، اور اللہ تمہارے ساتھ ہے اور وہ تمہارے اعمال (کا ثواب) ہرگز کم نہ کرے گاo''

۴۔ ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

وَ مَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَO(۳)

''اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) اور ایمان والوں کو دوست بنائے گا

(۱) آل عمران، ۳: ۱۳۹

(۲) محمد، ۴۷: ۳۵

(۳) المائدہ، ۵: ۵۶

تو (وہی اللہ کی جماعت ہے اور) اللہ کی جماعت (کے لوگ) ہی غالب ہونے والے ہیںo‘‘

۵۔ اس امر کی مزید وضاحت درج ذیل آیت سے بھی ہوتی ہے:

وَ لَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ وَ اِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَo(۱)

’’اور بے شک ہمارا فرمان ہمارے بھیجے ہوئے بندوں (یعنی رسولوں) کے حق میں پہلے صادر ہو چکا ہے۔ کہ بے شک وہی مدد یافتہ لوگ ہیںo اور بے شک ہمارا لشکر ہی غالب ہونے والا ہےo‘‘

اس آیت سے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ خدا کا وعدہ محض خالی دعویٰ نہیں بلکہ فی الواقع اس کارگہِ حیات میں حق و باطل کے درمیان ہونے والی کشمکش میں اہلِ حق کو غالب اور فتح یاب کر دینے کا مژدۂ جانفزا ہے اور یہی دعویٰ قرآن کی نتیجہ خیزی پر دلالت کرتا ہے۔

(۹) اُمیّتِ صاحبِ قرآن

حضور نبی اکرم ﷺ کی اُمیّت ایک زندہ جاوید حقیقت ہے۔ نبی اُمی ﷺ نے جب تبلیغِ دین کا علم بلند کیا اور مکہ کے کفار و مشرکین کو دامنِ اسلام سے وابستہ ہونے کی دعوت دی تو باطل کے ایوان لرز اُٹھے، حضور ﷺ کو امین اور صادق کہنے والے آپ ﷺ کی جان کے دُشمن ہو گئے، سازشوں کے ایک لامتناہی سلسلے کا آغاز ہوا۔ وہ کون سا افتراء و بہتان تھا جو ان لوگوں نے پیغمبر اسلام کے خلاف نہیں باندھا۔ آپ ﷺ کو (معاذ اللہ) ساحر، کاہن مجنون اور جانے کیا کیا نہ کہا، ایذا رسانی میں بھی کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا لیکن سب کچھ کہنے اور کرنے کے باوجود پورے عالم کفر میں سے کسی کو

(۱) الصّٰفّٰت، ۳۷: ۱۷۱۔۱۷۳

یہ کہنے کی جرأت نہ ہوسکی کہ آپ امی نہیں ہیں اور یہ قرآن آپ ﷺ کا اپنا تحریرکردہ ہے، گویا آپ پر اتہامِ کذب کوئی نہیں لگا سکا۔ آج تک مخالفین اسلام میں سے کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکا کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے اعلانِ نبوت سے قبل یا بعد کسی مکتب میں تعلیم حاصل کی اور کسی استاد کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کئے ہیں۔ کوئی یہ دعویٰ نہ کر سکا کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے کسی فاضل سے علوم و معارف، عربی ادب کی فصاحت و بلاغت، شعر و سخن کے اصول اور حکمت و دانائی کے خزانے حاصل کئے۔ حضور نبی اکرم ﷺ اپنے معاشرے میں اُمّی اور صادق و امین کی حیثیت سے معروف تھے۔ قرآن جیسے علم و معرفت سے معمور کلام کا آپ ﷺ کی زبان مبارک سے ادا ہونا ہی اس کی مُنَزَّل مِنَ اللهِ ہونے کی واضح دلیل ہے۔ اسی لئے ارشاد ربانی ہے:

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهِ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَo(۱)

”اور (اے حبیب!) اس سے پہلے آپ کوئی کتاب نہیں پڑھا کرتے تھے اور نہ ہی آپ اسے اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے ورنہ اہلِ باطل اسی وقت ضرور شک میں پڑ جاتےo“

پھر اسی سورہ میں آگے چل کر فرمایا گیا ہے:

اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اِنَّا اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ۔(۲)

”کیا ان کے لئے یہ (نشانی) کافی نہیں ہے کہ ہم نے آپ پر (وہ) کتاب نازل فرمائی ہے جو ان پر پڑھی جاتی ہے (یا ہمیشہ پڑھی جاتی رہے گی)۔“

(۱) العنکبوت، ۲۹: ۴۸

(۲) العنکبوت، ۲۹: ۵۱

اس سے پتہ چلا کہ آپ ﷺ پر ایسی کتاب کا نزول ہوا کہ آپ ﷺ کا اسے تلاوت کرنا ہی اس وحی کی صداقت و حقانیت کی روشن دلیل بن گیا۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ کوئی شخص کسی مکتب و مدرسہ یا استاد سے پڑھے بغیر زمانہ گزشتہ و آئندہ کے احوال بیان کرے، عقائدِ صحیحہ کا مدلل اِحقاق اور عقائدِ باطلہ کا قوی اِبطال کرے، انفرادی، اجتماعی اور بین الاقوامی زندگی کے اصول و ضوابط بیان کرے، اعلیٰ اخلاق اور مذہبی تعلیمات کا پرچار کرے، طبیعی اور مابعد الطبیعی حقائق کا تفصیلی ذکر کرے، سیاست و معاشرت، اقتصاد و معیشت اور تہذیب و ثقافت کے اصولوں کی تعلیم دے اور ان پر کامیابی سے عمل پیرا بھی ہو، صلح و جنگ اور قومی و بین الاقوامی امور سے متعلق قوانین بنائے، حکمت و دانائی، تدبر و بصیرت اور ضابطۂ اِصلاحِ اَحوال پر مبنی اس اعلیٰ فلسفہ حیات کی بات کرے جو ابد الآباد تک قابلِ عمل اور انقلاب آفریں ہو، لیکن پھر بھی اس کا کلام حق تصور نہ کیا جائے، ایسی کوئی بات کہنا بڑی ناانصافی ہو گا۔ بلا شک و شبہ حضور نبی اکرم ﷺ کا اُمّی ہونا قرآن کی حقانیت کی بہت بڑی دلیل ہے۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے اُمّی ہونے کے باوجود مَا کَانَ وَ مَا یَکُوْنُ کے جمیع علوم خود ربِ ذوالجلال سے حاصل کر لئے تھے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَ عَلَّمَکَ مَا لَمْ تَکُنْ تَعْلَمُ ط وَکَانَ فَضْلُ اللهِ عَلَیْکَ عَظِیْمًا○(۱)

”اور اس نے آپ کو وہ سب علم عطا فرمایا جو آپ نہیں جانتے تھے اور آپ پر اللہ کا بہت بڑا فضل ہے○“

۴۔ شخصی فضائل و خلقِ محمدی ﷺ کی کاملیت

جہاں حضور نبی اکرم ﷺ کو مکارم اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہے۔ آپ ﷺ نے عرب کے معاشرے میں جہاں اَخلاقی قدریں پامال ہو چکی تھیں اور انسانی

(۱) النساء، ۴:۱۱۳

معاشرہ اس اخلاقی گراوٹ اور نکبت کا شکار تھا جس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ آپ نے نہ صرف اخلاقی اقدار کو بحال کیا بلکہ ایسے افراد تیار کیے جو اخلاقی کردار اور شخصی فضائل کے حوالے سے پوری دنیا کے لیے رہنما اور قابل تقلید مثالی نمونے قرار پائے۔ ایسی مثالی شخصیات کا وجود میں آنا دراصل حضور نبی اکرم ﷺ کے شخصی فضائل اور آپ کے اعلیٰ اخلاق کا ہی نتیجہ تھا۔ سیدہ عائشہ صدیقہ سے جب پوچھا گیا کہ حضور نبی اکرم ﷺ خلق کیا تھا تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ آپ کا خلق قرآن حکیم ہے یعنی قرآن حکیم کی بیان کردہ اخلاقی تعلیمات اور شخصی فضائل کا چلتا پھرتا اور زندہ اور عملی نمونہ حضور نبی اکرم ﷺ کی ذات مبارکہ تھی۔ آپ کی ذات مبارکہ کی سینکڑوں ایسی جہات موجود ہیں جو اخلاقیات کے ہر پہلو کا احاطہ کرتی ہیں تاہم یہاں ہم ان چند جہتوں کا ذکر کر رہے ہیں:

(۱) خلقِ محمدی ﷺ کا معاشرتی پہلو

قرآن حکیم میں حضور نبی اکرم ﷺ کے حسن معاشرت کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے:

فَبِمَا رَحۡمَةٍ مِّنَ اللهِ لِنۡتَ لَهُمۡ ۚ وَلَوۡ كُنۡتَ فَظًّا غَلِيۡظَ الۡقَلۡبِ لَانۡفَضُّوۡا مِنۡ حَوۡلِكَ ۖ فَاعۡفُ عَنۡهُمۡ وَاسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ وَشَاوِرۡهُمۡ فِى الۡاَمۡرِ ۔ (۱)

’’(اے حبیبِ والا صفات!) پس اللہ کی کیسی رحمت ہے کہ آپ ان کے لئے نرم طبع ہیں اور اگر آپ تُندخُو (اور) سخت دل ہوتے تو لوگ آپ کے گرد سے چھٹ کر بھاگ جاتے، سو آپ ان سے درگزر فرمایا کریں اور ان کے لئے بخشش مانگا کریں اور (اہم) کاموں میں ان سے مشورہ کیا کریں۔‘‘

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب قرآن مجید کی آیت مبارکہ۔

(۱) آل عمران، ۳: ۱۵۹

﴿خُذِ الْعَفْوَ وَامُرْ بِالْعُرْفِ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِيْنَ٥﴾[1] ''(اے حبیبِ مکرّم!) آپ درگزر فرمانا اختیار کریں، اور بھلائی کا حکم دیتے رہیں اور جاہلوں سے کنارہ کشی اختیار کرلیں٥''﴾ - نازل ہوئی تو حضور نبی اکرم ﷺ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے پوچھا:

ما هذا يا جبريل؟

''اے جبریل! اس آیت سے کیا مراد ہے؟''

حضرت جبرئیل علیہ السلام نے عرض کیا: میں اس وقت تک نہیں بتا سکتا جب تک عالمِ کل (اللہ تعالیٰ) سے نہ پوچھ لوں۔ چنانچہ جبرئیل علیہ السلام (آسمان پر) چلے گئے۔ پھر کچھ دیر (بعد) واپس تشریف لائے اور عرض کیا:

إن الله تعالی يأمرک أن تعفو عمن ظلمک وتعطی من حرمک وتصل من قطعک۔[2]

''(یا رسول اللہ!) اللہ تعالیٰ نے (اس آیت میں) آپ کو حکم دیا ہے کہ آپ اس شخص کو جو آپ پر زیادتی کرے معاف فرما دیں اور جو شخص آپ کو محروم رکھے آپ اس کو عطا فرمائیں۔ جو شخص آپ سے رشتہ منقطع کرے آپ اس سے صلہ رحمی فرمائیں۔''

(۲) خلقِ محمدی ﷺ میں عفو کا پہلو

حضور نبی اکرم ﷺ کا ہمیشہ یہی کردار اور رویہ رہا کہ آپ نے ہمیشہ اپنے دشمنوں کو معاف فرمایا:

أن جابر بن عبد الله أخبر أنه غزا مع رسول الله قبل نجد فلما قفل

(۱) الاعراف، ۷: ۱۹۹

(۲) ۱۔ قرطبی، الجامع لأحکام القرآن، ۷: ۳۰۱
۲۔ ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، ۲: ۳۶۸
۳۔ آلوسی، روح المعانی، ۹: ۱۴۷

رسول الله قفل معه فأدركتهم القائلة فی واد كثير العضاة فنزل رسول الله وتفرق الناس يستظلون بالشجر فنزل رسول الله ﷺ تحت سمرة وعلق بها سيفه ونمنا نومة فإذا رسول الله ﷺ يدعونا وإذا عنده اعرابی فقال: إن هذا اخترط علی سيفی وأنا نائم فاستيقظت وهو فی يده صلتا فقال: من يمنعک منی فقلت الله ثلاثا ولم يعاقبه وجلس۔(۱)

’’حضرت جابربن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ وہ ایک مرتبہ حضور نبی اکرم ﷺ کے ہمراہ نجد کی طرف جنگ کے لیے گئے، جب حضور نبی اکرم ﷺ واپس تشریف لائے تو وہ بھی واپس آئے، راستے میں ایک وادی میں انہیں دوپہر ہوگئی جہاں کثرت سے خاردار درخت تھے۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے وہاں آرام کرنے کے ارادے سے پڑاؤ کیا، تو لوگ ادھر ادھر درختوں کے سایوں میں چلے گئے۔ حضور نبی اکرم ﷺ بھی ایک کیکر کے درخت کے نیچے لیٹ گئے۔ آپ نے اپنی تلوار درخت پر لٹکادی، ہم نے ابھی ایک اونگھ ہی لی تھی کہ ہمیں حضور نبی اکرم ﷺ کے بلانے کی آواز آئی۔ ہم جب آپ ﷺ کے پاس گئے تو ہم نے دیکھا کہ آپ ﷺ کے پاس ایک بدو بیٹھا ہے، آپ نے فرمایا: اس شخص نے میرے سوتے ہوئے میری تلوار اچک لی، میری آنکھ کھلی تو یہ تلوار لہرا رہا تھا اور کہہ رہا تھا تجھے میرے ہاتھ سے کون بچائے گا تجھے میرے ہاتھ سے کون بچائے گا؟ میں نے کہا ’’اللہ...... تین مرتبہ‘‘ پھر اس کے ہاتھ سے تلوار گر پڑی اور اب یہ بیٹھا ہے۔ پھر آپ نے اس کو معاف فرما دیا۔‘‘

عن انس: أن ثمانين هبطوا علی رسول الله ﷺ وأصحابه من

(۱) بخاری، الصحیح، کتاب الجهاد، باب من علق سيفه بالشجر فی السفر عند القائلة، ۳: ۱۰۶۵، رقم: ۲۷۵۳

جبل التنعيم عند صلاة الصبح و هم يريدون ان يقتلوه فأخذوا أخذاً فأعتقهم رسول الله ﷺ فأنزل الله (وَهُوَ الَّذِیْ كَفَّ اَیْدِیَهُمْ عَنْكُمْ وَاَیْدِیَكُمْ عَنْهُمْ)۔(۱)

’’حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، کہ اَسی (۸۰) افراد نے نماز فجر کے وقت جبل تنعیم پر سے حضور نبی اکرم ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام پر، آپ کے قتل کی نیت سے حملہ کر دیا، مگر وہ سب پکڑ لیے گئے۔ بعد میں آپ ﷺ نے ان سب کو رہا فرما دیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اور وہی ہے جس نے سرحدِ مکّہ پر (حدیبیہ کے قریب) ان (کافروں) کے ہاتھ تم سے اور تمہارے ہاتھ ان سے روک دیئے۔‘‘

ایک مرتبہ (جنگ خیبر میں، زینب نامی) ایک یہودی عورت نے حضور نبی اکرم ﷺ کی دعوت کی اور آپ کے کھانے کے لیے ایک مسموم (زہر آلود) بکری بھیجی، آپ نے اس سے ابھی ایک ہی لقمہ لیا تھا کہ آپ کو پتہ چل گیا اور آپ معجزانہ طور پر بچ گئے۔ اس یہودی عورت کو آپ کے پاس لایا گیا، مگر آپ نے اسے معاف کر دیا۔(۲)

اس قسم کے واقعات احادیث میں بکثرت ملتے ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کسی سے بدلہ نہیں لیتے تھے۔

---

(۱) ۱۔ ترمذی، السنن، کتاب تفسیر القرآن، باب ۴۹: ومن سورۃ الفتح، ۵:۳۸۶، رقم: ۳۲۶۴

۲۔ مسلم، الصحیح، کتاب الجهاد والسیر، باب قول الله تعالی: وهو الذی کف أیدیهم عنکم، ۳: ۱۴۴۲، رقم: ۱۸۰۸

(۲) بخاری، الصحیح، کتاب المغازی، باب الشاۃ التی سمت النبی ﷺ بخیبر، ۴: ۱۵۵۱، رقم: ۴۰۰۳

(۳) خلقِ محمدی ﷺ میں حلم کا پہلو

ایک یہودی کے حضور نبی اکرم ﷺ پر کچھ دینار قرض تھے، اس روایت میں یہ الفاظ ہیں: اس نے نبی اکرم ﷺ سے اپنے قرض کی ادائیگی کا مطالبہ کیا اور کہا کہ میں آپ کا پیچھا اس وقت تک نہ چھوڑوں گا جب تک آپ میرا قرض ادا نہ کریں گے، آپ نے فرمایا کہ اس وقت میرے پاس ادائیگی کے لیے کچھ نہیں ہے، مگر وہ یہودی مہلت دینے پر آمادہ نہ ہوا۔ تب آپ نے فرمایا کہ پھر تو یہاں بیٹھ جا اور آپ بھی اس کے پاس مسجد نبوی میں بیٹھ گئے۔ آپ ﷺ نے اسی حالت میں ظہر، عصر، مغرب، عشاء اور فجر کی نمازیں پڑھائیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس کو ڈانٹ ڈپٹ کر رہے تھے اور دھمکیاں دے رہے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے اس بات کو محسوس کر لیا، جو صحابہ اس کے ساتھ روا رکھے ہوئے تھے۔ صحابہ نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ ایک یہودی نے آپ کو روک رکھا ہے، آپ نے فرمایا کہ میرے پروردگار نے مجھے کسی غیر مسلم پر ظلم کرنے سے منع کیا ہوا ہے۔ پھر جب دن روشن ہوگیا تو اس یہودی نے کلمہ پڑھ کر اسلام قبول کرلیا۔ اس نے کہا بخدا میں نے آپ ﷺ کے ساتھ جو سلوک کیا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ میں توریت کی اس پیش گوئی کو آزمانا چاہتا تھا جس میں ہے کہ محمد بن عبداللہ ان کا مولد مکہ مکرمہ میں اور ہجرت گاہ مدینہ طیبہ میں ہے۔ اس کی بادشاہی شام تک ہوگی، وہ نہ تو ترش رو ہے اور نہ سخت دل اور نہ بازاروں میں چلانے والا اور نہ فحش گوئی اختیار کرنے والا ہے اور نہ بیہودہ بات کرنے والا، میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ یہ میرا تمام مال حاضر ہے اس کے متعلق آپ جو چاہیں حکم دیں۔[1]

(۴) خلقِ محمدی ﷺ میں حیا کا پہلو

حضور نبی اکرم ﷺ کی ذات مبارکہ حیا کا پیکر تھی:

(۱) خطیب تبریزی، مشکوۃ المصابیح، ۳: ۲۶۸، ۵۸۳۲

کان النبی ﷺ أشد حیاء من العذراء في خدرها فإذا رأی شیئا یکرهه، عرفناه في وجهه۔(۱)

’’حضور نبی اکرم ﷺ پردہ دار کنواری لڑکی سے بھی زیادہ حیاء والے تھے اور جب کوئی بات آپ ﷺ کو ناپسند ہوتی تو ہم آپ ﷺ کی ناپسندیدگی آپ ﷺ کے چہرے پر دیکھ لیا کرتے تھے۔‘‘

(۵) خلقِ محمدی ﷺ میں سخاوت کا پہلو

حضور نبی اکرم ﷺ اُس ابر رواں کی طرح تھے جو اپنے اور پرائے کی تمیز کے بغیر سب پر برستا اور اسے سیراب کرتا ہے۔

کان النبی ﷺ أحسن النّاس وأشجع النّاس وأجود النّاس۔(۲)

’’حضور نبی اکرم ﷺ تمام لوگوں میں سب سے زیادہ حسین، سب سے زیادہ بہادر اور سب سے زیادہ سخی تھے۔‘‘

حضور نبی اکرم ﷺ کی سخاوت اور فیاضی پر محدثین نے بہت سی روایات جمع کی ہیں۔

عن أنس رضی اللہ عنہ أن رجلاً ما سأل رسول اللہ ﷺ علی الإسلام شیئًا

(۱) ۱۔ بخاری، الصحیح، کتاب الأدب، باب من لم یواجه الناس، ۵: ۲۲۶۳، رقم: ۵۷۵۱

۲۔ مسلم، الصحیح، کتاب الفضائل، باب کثرة حیائه، ۴: ۱۸۰۹، رقم: ۲۳۲۰

۳۔ ابن ماجه، السنن، کتاب الزهد، باب الحیاء، ۲: ۱۳۹۹، رقم: ۴۱۸۰

(۲) ۱۔ بخاری، الصحیح، کتاب الجهاد، باب الشجاعة، ۳: ۱۰۳۸، رقم: ۲۶۶۵

۲۔ ترمذی، السنن، کتاب الجهاد، باب ما جاء فی الخروج، ۴: ۱۹۹، رقم: ۱۶۸۷

إلا أعطاه قال فجاءه رجل فأعطاه غنمًا بين جبلين فرجع إلى قومه فقال يا قوم أسلموا فإن محمدًا ليعطى عطاء لا يخشى الفاقة۔(۱)

’’حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جو بھی شخص حضور نبی اکرم ﷺ سے اسلام کے نام پر جو بھی چیز مانگتا آپ ﷺ اس کو عطا فرما دیتے۔ ایک دفعہ ایک شخص نے حضور نبی اکرم ﷺ سے دو پہاڑوں کے مابین ریوڑ مانگا آپ نے اسے مرحمت فرما دیا وہ شخص اپنی قوم کے پاس گیا اور کہا اے میری قوم کے لوگو مسلمان ہو جاؤ اس لیے کہ حضور نبی اکرم ﷺ اتنا دیتے ہیں کہ محتاجی کا اندیشہ نہیں رہتا۔‘‘

(۶) خلقِ محمدی ﷺ میں صبر کا پہلو

کائناتِ انسانی کی عظیم ترین ذمہ داری کا حامل ہونے اور سب سے زیادہ مشکلات، مصائب اور آلام کا سامنا کرنے کے باوجود آپ ﷺ سراپا صبر و استقلال تھے۔

كان أصبر الناس على اقذار الناس۔(۲)

’’رسول اللہ ﷺ لوگوں کی طرف سے آنے والی مصیبتوں پر سب سے زیادہ صبر کرنے والے تھے۔‘‘

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں:

(۱) ۱۔ مسلم، الصحيح، كتاب الفضائل، باب، ماسئل رسول الله ﷺ شيئاً قط، ۴: ۱۸۰۶، رقم: ۲۳۱۲

۲۔ ابن حبان، الصحیح، ۱۴: ۲۸۸، رقم: ۶۳۷۳

(۲) ۱۔ ہندی، کنز العمال، ۷: ۵۳، رقم: ۱۷۸۱۸

۲۔ مناوی، فیض القدیر، ۵: ۷۲

قال رسول الله ﷺ: لقد أخفت في الله وما يخاف أحد ولقد أوذيت في الله وما يؤذى أحد ولقد أتت علي ثلاثون من بين ليلة ويوم ومالي ولبلال طعام يأكله ذوكبد إلا شئى يواريه أبط بلال۔(۱)

’’حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: میں اللہ تعالیٰ کے راستے میں اتنا ڈرایا گیا ہوں کہ میرے سوا اور کوئی اتنا نہیں ڈرایا گیا اور مجھے اس کے بارے میں اتنی اذیت دی گئی جو کسی اور شخص کو نہیں دی گئی، مجھ پر تیس دن اور تیس راتیں ایسی گذر چکی ہیں کہ میرے اور بلال کے پاس کھانے کے لئے کوئی اور شے نہیں ہوتی تھی بجز اس (معمولی سی) خوراک کے جو بلال کی بغل میں ہوتی۔‘‘

امام ترمذی فرماتے ہیں:

ومعنى هذا الحديث حين خرج النبی ﷺ هارباً من مكة ومعه بلال انما كان مع بلال من الطعام ما يحمله تحت إبطه۔(۲)

’’یہ اس وقت کی بات ہے جب حضور نبی اکرم ﷺ مکہ مکرمہ سے ہجرت کے ارادہ سے نکلے تھے اور آپ کے ہمراہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ تھے اس وقت آپ دونوں کے پاس کھانے کے لئے معمولی سی خوراک بلال کی بغل میں ہوتی تھی۔‘‘

اسی طرح ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں:

---

(۱) ۱۔ ترمذی، السنن، کتاب صفة القيامة، باب منه، ۴: ۶۴۵، رقم: ۲۴۷۲
۲۔ ابن ماجه، السنن، المقدمه، باب فی فضائل أصحاب رسول الله ﷺ، ۱: ۵۴، رقم: ۱۵۱
۳۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۳: ۲۸۶، رقم: ۱۴۰۸۷

(۲) ترمذی، السنن، کتاب صفة القيامة، باب منه، ۴: ۶۴۵، رقم: ۲۴۷۲

إن کنا یئول محمد نمکث شهراً ما نستوقد بنار إن هو إلا الماء والتمر۔[1]

’’ہم خاندان محمد والے ایک ایک ماہ تک اس حال میں گزارتے تھے کہ ہمارے ہاں آگ نہیں جلتی تھی سوائے پانی اور کھجور کے (کچھ گھر میں نہیں ہوتا تھا)۔‘‘

(۷) خلقِ محمدی ﷺ اور مخلوق پر رحمت وشفقت

حضور نبی اکرم ﷺ کی زندگی اور آپ کا اخلاق حسنہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا مجسم اور کامل نمونہ تھے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث مبارکہ ہے:

ما رایت احداً کان أرحم بالعیال من رسول اللہ ﷺ۔[2]

’’میں نے حضور نبی اکرم ﷺ سے زیادہ کسی شخص کو اپنے گھر والوں پر مہربان اور شفیق نہیں دیکھا۔‘‘

اور اللہ تعالیٰ آپ کی تعریف میں فرماتے ہیں:

وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ ○[3]

’’اور (اے رسول محتشم) ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر تمام جہانوں کے لئے رحمت بنا کر۔‘‘

---

(۱) ترمذی، السنن، کتاب صفة القیامة، باب منه، ۴: ۶۴۵، رقم: ۲۴۷۱

(۲) ۱۔ مسلم، الصحیح، کتاب الفضائل، باب رحمة الصبیان، ۴: ۱۸۰۸، رقم: ۲۳۱۶

۲۔ أحمد بن حنبل، المسند، ۳: ۱۱۲، رقم: ۱۲۱۲۳

(۳) الانبیاء، ۲۱: ۱۰۷

نیز ارشاد فرمایا:

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝[1]

”بیشک تمہارے پاس تم میں سے (ایک باعظمت) رسول (ﷺ) تشریف لائے۔ تمہارا تکلیف و مشقت میں پڑنا ان پر سخت گراں (گزرتا) ہے۔ (اے لوگو!) وہ تمہارے لئے (بھلائی اور ہدایت کے) بڑے طالب و آرزومند رہتے ہیں (اور) مومنوں کے لئے نہایت (ہی) شفیق بے حد رحم فرمانے والے ہیں۔“

(۸) خلقِ محمدی ﷺ میں تواضع کا پہلو

حضور نبی اکرم ﷺ نرم خو، مہربان طبیعت، خوش صحبت، خندہ رُو اور بہت زیادہ تبسم کرنے والے تھے، مگر ایسا کہ اونچی آواز میں قہقہہ بلند نہیں کرتے تھے۔ آپ خوفِ خدا سے غمگین اور متفکر رہتے تھے اور جب اسلام کی حمیت میں غصہ آتا تو سخت غصہ آتا تھا، مگر اس میں بھی گالی گلوچ اور دوسروں کو برا بھلا کہنا یا اخلاق سے گرا ہوا طرزِ عمل شامل نہیں ہوتا تھا۔ آپ بہت زیادہ تواضع پسند تھے، مگر تواضع وقار سے خالی نہ تھا۔ آپ بہت زیادہ سخی اور فیاض تھے، مگر فضول خرچ ہرگز نہیں تھے۔ آپ اپنے رشتہ داروں اور تمام مسلمانوں سے صلہ رحمی فرماتے تھے، آپ بے حد نرم دل تھے۔ تواضع کا یہ عالم تھا کہ ننگے پاؤں گلیوں میں چلتے پھرتے، کبھی شکم سیری سے پیٹ میں گرانی نہیں ہوئی اور کبھی کسی قسم کا لالچ یا طمع نہیں کیا۔

حضور نبی اکرم ﷺ کے یہی اعلیٰ شخصی اور اعلیٰ اخلاق تھے جس نے ایک ایسی تہذیب کو جنم دیا جو کلیتًا اُلوہی اقدار پر مبنی تھی:

....This is the greatest divergence of traditions.

---

(۱) التوبہ، ۹:۱۲۸

There may be unbelievers and half believers among Muslims, but Islamic civilization is essentially a believing civilization and Europe essentially unbelieving. (1)

’’(اسلامی اور غیر اسلامی تہذیب میں) روایات کا عظیم ترین انحراف وانتشار موجود ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ مسلمانوں میں کچھ ملحدین اور نیمے دروں نیمے بروں بھی ہوں گے لیکن اسلامی تہذیب لازمی طور پر ایک ایمانی تہذیب اور یورپ لازماً غیر ایمانی تہذیب ہے۔‘‘

۵۔ تعلیماتِ محمدی ﷺ کی حفاظت و دائمیت

حضور نبی اکرم ﷺ کی تعلیمات جو قرآن و سنت پر مشتمل ہیں اور ان کی مزید عملی تفصیلات جو سیرت پر مشتمل ہیں آج تک لفظاً اور معناً دونوں صحت کے ساتھ محفوظ ہیں اور یہ تحریری حفاظت قیامت تک قائم رہے گی۔ اس طرح پہلے انبیاء کرام علیہم السلام میں سے کسی کی تعلیمات بھی اس طرح کاملاً محفوظ نہ رہ سکیں۔

آپ ﷺ پر نازل ہونے والی کتاب ’’قرآن مجید‘‘ کی حفاظت کی ذمہ داری اس وعدے کے ساتھ خود باری تعالیٰ نے اٹھالی تھی۔

اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّكۡرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ○ (۲)

’’بیشک یہ ذکرِ عظیم (قرآن) ہم نے ہی اتارا ہے اور یقیناً ہم ہی اس کی حفاظت کریں گے○‘‘

www.MinhajBooks.com

(1) Murad Wahbah, *Islam and Civilization: Proceedings of the First International Islamic Philosophy Conference*, Ain Shams University Press, 1982, p5.

(۲) الحجر، ۱۵: ۹

نتیجتاً قرآن مجید پوری روئے زمین پر ایک لفظ کے بھی اختلاف کے بغیر تحریراً اور مطبوعاً محفوظ ہے، شرق سے غرب تک قرآن مجید کے کروڑوں نسخے آج تک چھپے ہیں اور چھپ رہے ہیں مگر بخلاف بائیبل یا اناجیل کے کسی نسخے میں بھی کوئی فرق نہیں ہے جبکہ بائیبل یا اناجیل کا کوئی ایک نسخہ بھی دوسرے نسخے سے لفظاً مکمل مطابقت نہیں رکھتا۔

مزید یہ کہ قرآن مجید آج تک اپنی اصل زبان میں محفوظ ہے، اور اس کی زبان (عربی) کو بھی باری تعالیٰ نے زندہ زبان کے طور پر محفوظ فرما دیا ہے۔ بخلاف سنسکرت، عبرانی، سریانی، یونانی یا دیگر زبانوں کے، جن میں دوسرے انبیاء و رسل یا بانیان مذاہب کی اصل کتابیں مرتب کی گئیں۔ ان میں سے کوئی زبان بھی آج زندہ نہیں ہے اور نہ اس علاقے کے لوگ اور موجودہ نسلیں ہی ان زبانوں کو سمجھتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کتابیں اب صرف تراجم کی صورت میں پائی جاتی ہیں۔ ان کے اصل متن دنیا سے بالعموم ناپید ہو گئے ہیں۔ مگر قرآن مجید جس زبان میں نازل ہوا اور سنت و سیرت محمدی ﷺ جس زبان میں صادر اور مرتب ہوئی وہ زبان آج تک زندہ ہے، کروڑوں انسانوں میں بولی لکھی اور سمجھی جاتی ہے، ڈیڑھ ہزار سال بیت جانے کے باوجود وہ متروک یا ناقابل فہم نہیں ہوئی اور اس کی زندگی و تابندگی کی موجودہ صورت حال بتا رہی ہے کہ وہ قیامت تک مروج و متداول رہے گی۔ لہٰذا تعلیمات محمدی ﷺ کی حفاظت فقط تراجم ہی کے ذریعے نہیں بلکہ اصل زبان کی صورت میں بھی ہو رہی ہے پھر قرآن کے علاوہ جس طرح حضور ﷺ کی لاکھوں احادیث اور فرمودات کو سینکڑوں کتب کی صورت میں جمع اور مرتب کیا گیا، اور ان کی چھان بین کے لئے اصول وضوابط پر مبنی کئی تفصیلی فنون معرض وجود میں آئے دنیا کی تاریخ میں کسی اور پیغمبر یا بانی مذہب کی تعلیمات کی حفاظت کے لئے یہ اہتمام نہ کیا جاسکا یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ کی جملہ تعلیمات کو وہ دائمیت کی شان نصیب ہوگئی ہے کہ ان کے ذریعے صورت و سیرتِ محمدی ﷺ کا سراپائے جمیل آج بھی اہل ایمان کی نگاہوں کے سامنے رہتا ہے اور آپ ﷺ کی ذات اقدس کے جس بھی گوشہ و پہلو کی زیارت و

معرفت مطلوب ہو اوراقِ صحائف پلٹ کر آج بھی اس کا نظارہ کیا جاسکتا ہے۔

نزولِ قرآن کے ساتھ ہی حضور اکرم ﷺ نے قرآن کریم کی کتابت کا بھی خاص اہتمام فرمایا، کتابت کا طریق کار حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے ایک حدیث میں یہ بیان فرمایا ہے:

كنت أكتب الوحى لرسول الله ﷺ وكان إذ انزل عليه الوحى أخذته برحاء شديدة وعرق عرقا شديدا مثل الجُمان ثم سري عنه، فكنت ادخل عليه بقطعة الكتف او كسوة فاكتب وهو يُملى علىّ فما افرغ حتى تكاد رجلى تنكسر من نقل القرآن حتى أقول لا أمشى على رجلى أبدا فإذا فرغت قال اقرأه فأقره فان كان فيه سقط اقامه ثم اخرج به الى الناس۔[1]

’’میں رسول اللہ ﷺ کے لئے وحی کی کتابت کرتا تھا، جب آپ ﷺ پر وحی نازل ہوتی تو آپ کو سخت گرمی لگتی تھی، اور آپ ﷺ کے جسم اطہر پر پسینہ کے قطرے موتیوں کی طرح ڈھلکنے لگتے تھے، پھر آپ ﷺ سے یہ کیفیت ختم ہوجاتی، تو میں مونڈھے کی کوئی ہڈی (یا کسی اور چیز کا) ٹکڑا لے کر خدمت میں حاضر ہوتا آپ ﷺ لکھواتے رہتے اور میں لکھتا جاتا، یہاں تک کہ جب میں لکھ کر فارغ ہوتا تو قرآن کو نقل کرنے کے بوجھ سے مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میری ٹانگ ٹوٹنے والی ہے، اور میں کبھی چل نہیں سکوں گا، بہرحال! جب میں فارغ ہوتا تو آپ ﷺ فرماتے: پڑھو میں پڑھ کر سناتا، اگر اس میں کوئی فروگذاشت ہوتی تو آپ ﷺ اس کی اصلاح فرما دیتے، اور پھر اسے لوگوں

(۱) ۱۔ طبرانی، المعجم الاوسط، ۲: ۲۵۷

۲۔ ہیثمی، مجمع الزوائد، ۸: ۲۵۷

کے سامنے لے آتے۔‘‘

کتابتِ وحی کے لیے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے علاوہ آپ ﷺ نے بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی مقرر فرمایا ہوا تھا، جو حسب ضرورت کتابتِ وحی کے فرائض انجام دیتے تھے، کاتبین وحی کی تعداد چالیس تک شمار کی گئی ہے۔ لیکن ان میں سے زیادہ مشہور یہ حضرات ہیں:

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن ابی سرح رضی اللہ عنہ، حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ، حضرت خالد بن سعید بن العاص رضی اللہ عنہ، حضرت ابان بن سعید بن العاص رضی اللہ عنہ، حضرت حنظلہ ابن الربیع رضی اللہ عنہ، حضرت معقیب بن ابی فاطمہ رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن ارقم الزہری رضی اللہ عنہ، حضرت شرجیل بن حسنہ رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ، حضرت عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ، حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ، حضرت ثابت بن قیس بن شماس رضی اللہ عنہ، حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ، حضرت معاویہ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہ، حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ۔

حضور نبی اکرم ﷺ کا معمول یہ تھا کہ جب قرآن کریم کا کوئی حصہ نازل ہوتا تو آپ ﷺ کاتب وحی کو یہ ہدایت بھی فرما دیتے تھے کہ اسے فلاں سورۃ میں فلاں آیات کے بعد لکھا جائے، چنانچہ اسے آپ ﷺ کی ہدایت کے مطابق لکھ لیا جاتا تھا، قرآنی آیات زیادہ تر پتھر کی سلوں، اور چمڑے کے پارچوں، کھجور کی شاخوں، بانس کے ٹکڑوں، درخت کے پتوں اور جانوروں کی ہڈیوں پر لکھی جاتی تھیں، البتہ کبھی کبھی کاغذ کے ٹکڑے بھی استعمال کئے گئے ہیں۔ (۱)

اس طرح عہدِ رسالت ﷺ میں قران کریم کا ایک نسخہ تو وہ تھا جو حضور نبی اکرم ﷺ نے اپنی نگرانی میں لکھوایا تھا، اگرچہ وہ کتابی شکل میں نہ تھا بلکہ متفرق حصوں پر مشتمل تھا، اس کے ساتھ ہی بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی اپنی یادداشت کے لئے قرآن کریم

(۱) عسقلانی، فتح الباری، ۹: ۱۸

کی آیات اپنے پاس لکھ لیتے تھے، اور یہ سلسلہ اسلام کے بالکل ابتدائی دور سے جاری تھا جس کی شہادت اس بات سے ملتی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بہن فاطمہ بنت الخطاب اور بہنوئی حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے پہلے مسلمان ہوچکے تھے، اور جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کے مسلمان ہونے کی خبر سن کر غصہ میں بھرے ہوئے گھر میں داخل ہوئے تو ان کے سامنے ایک صحیفہ رکھا ہوا تھا، جس میں سورۂ طٰہٰ کی آیات درج تھیں، اور حضرت خباب بن حارث رضی اللہ عنہ انہیں پڑھا رہے تھے۔ (۱)

اس کے علاوہ متعدد روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے انفرادی طور پر اپنے پاس قرآن کریم کے مکمل یا نا مکمل نسخے لکھ رکھے تھے، مثلاً صحیح بخاری میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

أن رسول الله ﷺ نهی أن يسافر بالقرآن إلی أرض العدوّ۔ (۲)

''رسول اللہ ﷺ نے قرآن کریم کو لے کر دشمن کی زمین میں سفر کرنے سے منع فرمایا۔''

ایک روایت میں ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

قرأة الرجل فی غير المصحف الف درجة وقرأءته فی المصحف تضاعف علی ذلک ألفي درجة۔ (۳)

''کوئی شخص قرآن کریم کے نسخہ کو دیکھے بغیر تلاوت کرے تو اس کا ثواب ایک ہزار

(۱) ۱۔ دارقطنی، السنن، ۱: ۱۲۳
۲۔ ہیثمی، مجمع الزوائد، ۹: ۶۱

(۲) بخاری، الصحیح کتاب الجهاد، باب کراهية السفر بالمصاحف، ۳: ۱۰۹۰، رقم: ۲۸۲۸

(۳) ۱۔ طبرانی، المعجم الکبير، ۱: ۲۲۱
۲۔ ہیثمی، مجمع الزوائد، ۷: ۱۶۵

درجہ ہے، اور اگر قرآن کے نسخہ کو دیکھ کر تلاوت کرے تو دو ہزار درجے ہے۔‘‘

ان دونوں روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حفاظت قرآن کا عمل نزول قرآن کے ساتھ ہی مختلف سطحات پر شروع ہو گیا تھا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کے پاس عہدِ رسالت ہی میں قرآن کریم کے لکھے ہوئے صحیفے موجود تھے۔

حضور نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں قرآن کریم کے جتنے نسخے لکھے گئے تھے وہ متفرق اشیاء پر لکھے ہوئے تھے، کوئی آیۃ چمڑے پر، کوئی درخت کے پتے پر، کوئی ہڈی پر، زیادہ مکمل نسخے نہیں تھے، کسی صحابی کے پاس ایک سورت لکھی ہوئی تھی، کسی کے پاس دس پانچ سورتیں، اور کسی کے پاس صرف چند آیات لکھی ہوئی تھیں۔

اس بناء پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں یہ فیصلہ کیا کہ قرآن کریم کے ان منتشر حصوں کو یک جا کر کے محفوظ کر دیا جائے، جن اسباب کے تحت یہ فیصلہ کیا گیا اس کی تفصیل حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے یوں بیان فرمائی کہ جنگ یمامہ کے فوراً بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ایک روز مجھے پیغام بھیج کر بلوایا، میں ان کے پاس پہنچا، تو وہاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مجھ سے فرمایا کہ عمر رضی اللہ عنہ نے ابھی آ کر مجھ سے یہ بات کہی ہے کہ جنگ یمامہ میں قرآن کریم کے حفاظ کی ایک بڑی جماعت شہید ہوگئی، اور اگر مختلف مقامات پر قرآن کریم کے حافظ اسی طرح شہید ہوتے رہے تو مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں قرآن کا ایک بڑا حصہ ناپید نہ ہوجائے، لہٰذا میری رائے یہ ہے کہ آپ اپنے حکم سے قرآن کریم کو جمع کروانے کا کام شروع کر دیں میں نے عمر رضی اللہ عنہ سے کہا، کہ جو کام حضور اکرم ﷺ نے نہیں کیا وہ ہم کیسے کریں؟ عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ خدا کی قسم! یہ کام بہتر ہی بہتر ہے، اس کے بعد عمر رضی اللہ عنہ مجھ سے بار بار یہی کہتے رہے یہاں تک کہ مجھے بھی اس پر شرح صدر ہوگیا، اور اب میری رائے بھی وہی ہے جو عمر رضی اللہ عنہ کی ہے۔ اس کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مجھ سے فرمایا کہ تم نوجوان اور سمجھدار آدمی ہو، ہمیں تمہارے بارے میں کوئی بدگمانی نہیں ہے، تم رسول اللہ ﷺ کے سامنے کتابت وحی

کا کام بھی کرتے رہے ہو، لہٰذا تم قرآن کریم کی آیتوں کو تلاش کر کے انہیں جمع کرو۔‘‘

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ خدا کی قسم! اگر یہ حضرات مجھے کوئی پہاڑ ڈھونے کا حکم دیتے تو مجھ پر اس کا اتنا بوجھ نہ ہوتا، جتنا جمع قرآن کے کام کا ہوا، میں نے ان سے کہا کہ آپ وہ کام کیسے کر رہے ہیں جو رسول اللہ ﷺ نے نہیں کیا، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ خدا کی قسم! یہ کام بہتر ہی بہتر ہے، اس کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ مجھ سے بار بار یہی کہتے رہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے میرا سینہ اسی رائے کے لئے کھول دیا جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ کی رائے تھی، چنانچہ میں نے قرآنی آیات کو تلاش کرنا شروع کیا، اور کھجور کی شاخوں، پتھر کی تختیوں اور لوگوں کے سینوں سے قرآن کو جمع کیا۔ [1]

جمع قران کے سلسلہ میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے بہت ہی محتاط طریق کار اختیار فرمایا۔ وہ خود حافظ قرآن تھے، لہٰذا وہ اپنی یادداشت سے پورا قرآن لکھ سکتے تھے، ان کے علاوہ بھی سینکڑوں حفاظ اس وقت موجود تھے، ان کی ایک جماعت بنا کر بھی قرآن کریم لکھا جاسکتا تھا، نیز قرآن کریم کے جو مکمل نسخے حضور اکرم ﷺ کے زمانے میں لکھ لئے گئے تھے، حضرت زید رضی اللہ عنہ ان سے بھی قرآن کریم نقل فرماسکتے تھے، لیکن انہوں نے احتیاط کے پیش نظر ان میں سے صرف کسی ایک طریقہ پر اکتفاء نہیں فرمایا، بلکہ ان تمام ذرائع سے بیک وقت کام لیا اور اس وقت تک کوئی آیت اپنے صحیفوں میں درج نہیں کی جب تک اس کے متواتر ہونے کی تحریری اور زبانی شہادتیں نہیں مل گئیں، اس کے علاوہ آنحضرت ﷺ نے قرآن کریم کی جو آیات اپنی نگرانی میں لکھوائی تھیں وہ مختلف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے پاس محفوظ تھیں، حضرت زید رضی اللہ عنہ نے انہیں یک جا فرمایا تاکہ نیا نسخہ ان سے ہی نقل کیا جائے، چنانچہ یہ اعلان عام کر دیا گیا کہ جس شخص کے پاس قرآن کریم کی کوئی آیات لکھی ہوئی موجود ہوں وہ حضرت زید رضی اللہ عنہ کے پاس لے آئے، اور جب کوئی

(۱) عسقلانی، فتح الباری، ۹: ۸، ۱۳

شخص ان کے پاس قرآن کریم کی کوئی لکھی ہوئی آیت لے کر آتا تو وہ مندرجہ ذیل چار طریقوں سے اس کی تصدیق کرتے تھے:

۱۔ سب سے پہلے اپنی یادداشت سے اس کی توثیق کرتے تھے۔

۲۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی حافظ قرآن تھے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے حکم کے تحت وہ بھی اس کام میں حضرت زید رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے، لہٰذا جب کوئی شخص کوئی آیت لے کر آتا تھا تو حضرت زید رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ دونوں مشترک طور پر اسے وصول کرتے تھے۔ لہٰذا حضرت زید رضی اللہ عنہ کے علاوہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی اپنے حافظہ سے اس کی توثیق فرماتے تھے۔(۱)

۳۔ کوئی لکھی ہوئی آیت اس وقت تک قبول نہ کی جاتی تھی جب تک دو قابل اعتبار گواہوں نے اس بات کی گواہی نہ دیدی ہو کہ یہ آیت حضور اکرم ﷺ کے سامنے لکھی گئی تھی، یہ گواہیاں اس بات پر بھی لی جاتی تھیں کہ یہ لکھی ہوئی آیت حضور اکرم ﷺ کی وفات کے سال آپ ﷺ کی خدمت میں پیش کردی گئی تھیں، اور آپ ﷺ نے اس بات کی تصدیق فرمادی تھی کہ یہ ان حروفِ سبعہ کے مطابق ہے جن پر قرآن کریم نازل ہوا ہے۔(۲)

۴۔ اس کے بعد ان لکھی ہوئی آیتوں کا ان مجموعوں کے ساتھ مقابلہ کیا جاتا تھا جو مختلف صحابہ رضی اللہ عنہم نے تیار کر رکھے تھے، اس طریق کار کا مقصد یہ تھا کہ قرآن کریم کی کتابت میں زیادہ سے زیادہ احتیاط سے کام لیا جائے اور صرف حافظہ پر اکتفاء کرنے کے بجائے بعینہ ان آیات سے نقل کیا جائے جو حضور اکرم ﷺ کے سامنے لکھی گئی تھیں۔(۳)

---

(۱) عسقلانی، فتح الباری، ۹: ۸، ۱۳

(۲) سیوطی، الاتقان فی علوم القرآن، ۱: ۶۰

(۳) ۱۔ زرکشی، البرھان فی علوم القران، ۱: ۲۳۸
۲۔ سیوطی، الاتقان فی علوم القرآن، ۱: ۶۰

جمع قرآن کا یہی طریق کار تھا کہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو جب سورہ براءۃ کی آخری آیات - لَقَدۡ جَآءَكُمۡ رَسُوۡلٌ مِّنۡ اَنۡفُسِكُمۡ - مجھے صرف حضرت ابوخزیمہ کے پاس ملیں، تو آپ نے انہیں اس وقت تک قبول نہیں کیا جب تک ان کی طرف سے انہیں حضور اکرم ﷺ کا ذوالشہادتین کا منصب عطا کیے جانے کا ثبوت میسر نہیں آ گیا۔ مزید براں گو جو لوگ حضور اکرم ﷺ کی لکھوائی ہوئی قرآن کریم کی متفرق آیتیں لے لے کر آ رہے تھے ان میں سے یہ آیتیں سوائے حضرت خزیمہ رضی اللہ عنہ کے کسی کے پاس نہیں ملیں، مگر جہاں تک ان آیات کے جزو قرآن ہونے کا تعلق ہے یہ بات تواتر کے ساتھ سب کو معلوم تھی، اول تو جن سینکڑوں حفاظ کو پورا قرآن کریم یاد تھا، انہیں یہ آیات بھی یاد تھیں، دوسرے آیات قرآنی کے جو مکمل مجموعے مختلف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے تیار کر رکھے تھے ان میں بھی یہ آیت لکھی ہوئی تھی، لیکن چونکہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے مزید احتیاط کے لئے مذکورہ بالا ذرائع پر اکتفاء کرنے کے بجائے متفرق طور سے لکھی ہوئی آیتوں کو جمع کرنے کا بیڑا بھی اٹھایا تھا، اس لئے انہوں نے یہ آیت اس وقت تک اس نئے مجموعہ میں درج نہیں کی، جب تک اس تیسرے طریقہ سے بھی وہ آپ کو دستیاب نہیں ہوگئی، دوسری آیات کا معاملہ تو یہ تھا کہ وہ حفاظ صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کو یاد ہونے اور عہد رسالت ﷺ کے مکمل مجموعوں میں محفوظ ہونے کے علاوہ کئی کئی صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کے پاس الگ سے لکھی ہوئی بھی تھیں، چنانچہ ایک ایک آیت کئی کئی صحابہ رضی اللہ عنہ لے کر آ رہے تھے، اس کے برعکس سورۂ براءت کی یہ آخری آیات سینکڑوں صحابہ کو یاد تو تھیں، اور جن حضرات کے پاس آیات قرآنی کے مکمل مجموعے تھے ان کے پاس لکھی ہوئی بھی تھیں، لیکن حضور نبی اکرم ﷺ کی نگرانی میں الگ لکھی ہوئی صرف حضرت ابوخزیمہ رضی اللہ عنہ کے پاس ملیں، کسی اور کے پاس نہیں۔(۱)

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے اس کمال احتیاط کے ساتھ آیاتِ قرآنی کو جمع

(۱) زرکشی، البرہان فی علوم القرآن: ۲۳۴، ۲۳۵

کر کے انہیں کاغذ کے صحیفوں پر مرتب شکل میں تحریر فرمایا۔[۱]

اس طرح ہر سورۃ علیحدہ صحیفے میں لکھی گئی، اس لئے یہ نسخہ بہت سے صحیفوں میں مشتمل تھا، اصطلاح میں اس نسخہ کو ''ام'' کہا جاتا ہے، اور اس کی خصوصیات یہ تھیں:

۱۔ اس نسخہ میں آیات قرآنی تو حضور اکرم ﷺ کی بتائی ہوئی ترتیب کے مطابق مرتب تھیں، لیکن سورتیں مرتب نہ تھیں، ہر سورت الگ الگ لکھی ہوئی تھی۔[۲]

۲۔ اس نسخہ میں ساتوں حروف جمع تھے۔[۳]

۳۔ یہ نسخہ خط حیری میں لکھا گیا تھا۔

۴۔ اس میں صرف وہ آیتیں درج کی گئی تھیں جن کی تلاوت منسوخ نہیں ہوئی تھی۔

۵۔ اس کو لکھوانے کا مقصد یہ تھا کہ ایک مرتب نسخہ تمام امت کی اجماعی تصدیق کے ساتھ تیار ہو جائے، تاکہ ضرورت پڑنے پر اس کی طرف رجوع کیا جا سکے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے لکھوائے ہوئے یہ صحیفے آپ کی حیات میں آپ کے پاس رہے، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس رہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد ان کی وصیت کے مطابق انہیں ام المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس منتقل کر دیا گیا۔[۴]

جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے تو اسلام عرب سے نکل کر روم اور ایران کے دور دراز علاقوں تک پہنچ چکا تھا، ہر نئے علاقہ کے لوگ جب مسلمان ہوتے تو وہ ان مجاہدین اسلام یا ان تاجروں سے قران کریم سیکھتے جن کی بدولت انہیں اسلام کی نعمت حاصل ہوئی تھی، چوں کہ قرآن کریم سات حروف پر نازل ہوا تھا، اور مختلف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اسے

www.MinhajBooks.com

---

(۱) سیوطی، الاتقان فی علوم القرآن، ۱: ٦٠

(۲) سیوطی، الاتقان فی علوم القرآن، ۱: ٦٠

(۳) زرقانی، مناهل العرفان، ۱: ۲۴٦، ۲۴۷

(۴) عسقلانی، فتح الباری، ۹: ۱۲، ۱۳

حضور اکرم ﷺ سے مختلف قراتوں کے مطابق سیکھا تھا، اس لئے ہر صحابی نے اپنے شاگردوں کو اسی قرأت کے مطابق قرآن پڑھایا، جس کے مطابق خود اس نے حضور نبی اکرم ﷺ سے پڑھا تھا، اس طرح قراتوں کا یہ اختلاف دور دراز ممالک تک پہنچ گیا، جب تک لوگ اس حقیقت سے واقف تھے کہ قرآن کریم سات حروف پر نازل ہوا ہے، اس وقت تک اس اختلاف سے کوئی خرابی پیدا نہیں ہوئی، لیکن جب یہ اختلاف دور دراز ممالک میں پہنچا، اور یہ بات ان میں پوری طرح مشہور نہ ہوسکی کہ قرآن کریم سات حروف پر نازل ہوا ہے، تو اس وقت لوگوں میں یہ جھگڑے پیش آنے لگے، بعض لوگ اپنی قراءت کو صحیح اور دوسرے کی قرات کو غلط قرار دینے لگے، ان جھگڑوں سے ایک طرف تو یہ خطرہ تھا کہ لوگ قران کریم کی متواتر قراتوں کو غلط قرار دینے کی سنگین غلطی میں مبتلا ہوں گے، دوسرے سوائے حضرت زید رضی اللہ عنہ کے لکھے ہوئے ایک نسخہ کے جو مدینہ طیبہ میں موجود تھا، پورے عالم اسلام میں کوئی ایسا معیاری نسخہ موجود نہ تھا جو پوری امت کے لئے حجت بن سکے، کیونکہ دوسرے نسخے انفرادی طور پر لکھے ہوئے تھے اور ان میں ساتوں حروف کو جمع کرنے کا کوئی اہتمام نہیں تھا، اس لئے ان جھگڑوں کے تصفیہ کی کوئی قابل اعتماد صورت یہی تھی کہ ایسے نسخے پورے عالم اسلام میں پھیلا دیئے جائیں جن میں ساتوں حروف جمع ہوں اور انہیں دیکھ کر درست اور غلط قرات کا فیصلہ کیا جاسکے۔ یہ عظیم کارنامہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں انجام پایا۔

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ آرمیںیا اور آذر بائیجان کے محاذ پر جہاد میں مشغول تھے، وہاں انہوں نے دیکھا کہ لوگوں میں قرآن کریم کی قراتوں کے بارے میں اختلاف ہو رہا ہے، چنانچہ مدینہ طیبہ واپس آتے ہی وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ امیر المؤمنین! قبل اس کے کہ یہ امت اللہ کی کتاب کے بارے میں یہود و نصاریٰ کی طرح اختلاف کا شکار ہو آپ اس کا تدارک کیجئے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے پوچھا بات کیا ہے؟ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے جواب میں کہا کہ میں آرمیںیا کے محاذ پر جہاد

میں شامل تھا، وہاں میں دیکھا کہ شام کے لوگ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی قرات پڑھتے ہیں جو اہل عراق نے نہیں سنی ہوتی، اور اہل عراق عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قرات پڑھتے ہیں جو اہل شام نے نہیں سنی ہوتی اس کے نتیجہ میں ایک دوسرے کو کافر قرار دے رہے ہیں۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خود بھی اس ضرورت کو محسوس کر چکے تھے، انہیں یہ اطلاع ملی تھی کہ خود مدینہ طیبہ میں ایسے واقعات پیش آئے ہیں کہ قرآن کریم کے ایک معلم نے اپنے شاگردوں کو ایک قرات کے مطابق قرآن پڑھایا اور دوسرے معلم نے دوسری قرات کے مطابق، اس طرح مختلف اساتذہ کے شاگرد جب باہم ملتے تو ان میں اختلاف ہوتا اور بعض مرتبہ یہ اختلاف اساتذہ تک پہنچ جاتا، اور وہ بھی ایک دوسرے کی قرات کو غلط قرار دیتے، جب حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ نے بھی اس خطرے کی طرف توجہ دلائی تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جلیل القدر صحابہ رضی اللہ عنہم کو جمع کر کے ان سے مشورہ کیا۔حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میری رائے یہ ہے کہ ہم تمام لوگوں کو ایک مصحف پر جمع کر دیں، تا کہ کوئی اختلاف اور افتراق پیش نہ آئے صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس رائے کو پسند کر کے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی تائید فرمائی۔

چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو جمع کر کے ایک خطبہ دیا اور اس میں فرمایا کہ تم لوگ مدینہ طیبہ میں میرے قریب ہوتے ہوئے قرآن کریم کی قراتوں کے بارے میں ایک دوسرے کی تکذیب اور ایک دوسرے سے اختلاف کرتے ہو، اس سے ظاہر ہے کہ جو لوگ مجھ سے دور ہیں وہ تو اور بھی زیادہ تکذیب اور اختلاف کرتے ہوں گے، لہٰذا تمام لوگ مل کر قرآن کریم کا ایسا نسخہ تیار کریں جو سب کے لئے واجب الاقتداء ہو۔

اس غرض کے لئے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے حضرت حفصہ رضي الله عنها کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ کے پاس (حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانے کے) جو صحیفے موجود ہیں وہ ہمارے پاس بھیج دیجئے، ہم ان کو مصاحف میں نقل کر کے آپ کو واپس کر دیں گے، حضرت حفصہ رضي الله عنها نے وہ صحیفے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس بھیج دیئے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے چار صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت بنائی، جو حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ

بن زبیر رضی اللہ عنہ حضرت سعید بن العاص رضی اللہ عنہ اور حضرت عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشام رضی اللہ عنہ پر مشتمل تھی، اس جماعت کو اس کام پر مامور کیا گیا کہ وہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے صحیفوں سے نقل کر کے کئی ایسی مصاحف تیار کرے جن میں سورتیں بھی مرتب ہوں، ان صحابہ میں سے چار حضرت زید رضی اللہ عنہ انصاری تھے، اور باقی تینوں حضرات قریشی تھے، اس لئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان سے فرمایا کہ جب تمہارا اور زید رضی اللہ عنہ کا قرآن کے کسی حصہ کے طرز تحریر میں اختلاف ہو تو اسے قریش کی زبان کے مطابق لکھنا، اس لئے کہ قرآن کریم انہی کی زبان میں نازل ہوا ہے۔

بنیادی طور پر یہ کام مذکورہ چار حضرات ہی کے سپرد کیا گیا تھا، لیکن پھر دوسرے صحابہ کو بھی ان کی مدد کے لئے ساتھ لگا دیا گیا، یہاں تک کہ ابن ابی داود کی روایت کے مطابق ان حضرات کی تعداد بارہ تک پہنچ گئی جن میں حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ، حضرت کثیر بن افلح رضی اللہ عنہ، حضرت مالک بن ابی عامر رضی اللہ عنہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ (۱)

ان حضرات نے کتابت قرآن کے سلسلے میں مندرجہ ذیل کام انجام دیئے:

۱۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جو نسخہ تیار ہوا تھا اس میں سورتیں مرتب نہیں تھیں، بلکہ ہر سورت الگ الگ لکھی ہوئی تھی، ان حضرات نے تمام سورتوں کو ترتیب کے ساتھ ایک ہی مصحف میں لکھا۔ (۲)

۲۔ قرآن کریم کی آیات اس طرح لکھیں کہ ان کے رسم الخط میں تمام متواتر قراتیں سما جائیں، اسی لئے ان پر نہ نقطے لگائے گئے اور نہ حرکات (زیر، زبر، پیش) تاکہ اسے تمام متواتر قراتوں کے مطابق پڑھا جا سکے، مثلاً ننشزھا لکھا، تاکہ اسے نَنشُزُھَا اور نُنشِزُھَا دونوں طرح پڑھا جا سکے، کیونکہ یہ دونوں قراتیں درست ہیں۔ (۳)

(۱) عسقلانی، فتح الباری، ۹: ۱۳، ۱۵
(۲) حاکم، المستدرک، ۲: ۲۲۹
(۳) زرقانی، مناهل العرفان، ۱: ۲۸۹

۳۔ اب تک قرآن کریم کا مکمل معیاری نسخہ جو پوری امت کی اجتماعی تصدیق سے مرتب کیا گیا ہو صرف ایک تھا، ان حضرات نے اس نئے مرتب مصحف کی ایک سے زائد نقلیں تیار کیں۔ ابو حاتم سجستانی رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے سات نسخے تیار کروائے، جن میں سے ایک مکہ مکرمہ، ایک شام، ایک یمن، ایک بحرین، ایک بصرہ اور ایک کوفہ بھیج دیا گیا، اور ایک مدینہ طیبہ میں محفوظ رکھا گیا۔

۴۔ اس کے لئے ان حضرات نے بنیادی طور پر تو انہی صحیفوں کو سامنے رکھا جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں لکھے گئے تھے، اس کے ساتھ ہی مزید احتیاط کے لئے وہی طریق کار اختیار فرمایا، جو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اختیار کیا گیا تھا، چنانچہ حضور نبی اکرم ﷺ کے زمانے کی جو متفرق تحریریں مختلف صحابہ رضی اللہ عنہم کے پاس محفوظ تھیں، انہیں دوبارہ طلب کیا گیا اور ان کے ساتھ از سرنو مقابلہ کر کے یہ نئے نسخے تیار کئے گئے، اس مرتبہ سورۂ احزاب کی ایک آیت - ﴿مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَاعَاهَدُو اللّٰهَ عَلَيْهِ﴾ - علیحدہ لکھی ہوئی صرف حضرت خزیمہ بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ کے پاس ملی، حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

فقدت آية من الاحزاب حين نسخنا المصحف كنت أسمع رسول الله ﷺ يقرأبها، فالتمسناها فوجدناها مع خزيمة بن ثابت الانصاری رضی اللہ عنہ.(۱)

”مجھے مصحف لکھتے وقت سورہ احزاب کی آیت نہ ملی جو میں رسول اللہ ﷺ کو پڑھتے ہوئے سنا کرتا تھا ہم نے اسے تلاش کیا تو وہ خزیمہ بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ کے پاس ملی۔“

(۱) ۱۔ بخاری، الصحيح، كتاب المغازی، باب غزوة أحد، ۴: ۱۴۸۸، رقم: ۳۸۲۳

۲۔ عسقلانی، فتح الباری، ۹: ۱۵

گویا یہ آیت حضرت زید رضی اللہ عنہ اور دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم کو اچھی طرح یاد تھی، کیونکہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جو صحیفے لکھے گئے ظاہر ہے کہ یہ آیت ان میں موجود تھی، نیز دوسرے صحابہ کے پاس قرآن کریم کے جو انفرادی طور پر لکھے ہوئے نسخے موجود تھے ان میں یہ آیت بھی شامل تھی، لیکن چونکہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانے کی طرح اس مرتبہ بھی ان تمام متفرق تحریروں کو جمع کیا گیا تھا جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے پاس لکھی ہوئی تھیں، اس لئے کوئی آیت ان مصاحف میں اس وقت تک نہیں لکھی گئے جب تک وہ ان تحریروں میں بھی نہ مل گئی۔ اس طرح دوسری آیتیں تو متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے پاس علیحدہ لکھی ہوئی بھی ملیں، لیکن سورۂ احزاب کی یہ آیت سوائے حضرت خزیمہ بن ثابت رضی اللہ عنہ کے کسی اور کے پاس الگ لکھی ہوئی دستیاب نہیں ہوئی۔

۵۔ قران کریم کے یہ متعدد معیاری نسخے تیار فرمانے کے بعد حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے وہ تمام انفرادی نسخے نذر آتش کر دیئے جو مختلف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے پاس موجود تھے تاکہ رسم الخط، مسلمہ قراتوں کے اجتماع اور سورتوں کی ترتیب کے اعتبار سے تمام مصاحف یکساں ہوجائیں، اور ان میں کوئی اختلاف باقی نہ رہے، اس کے لیے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی تمام صحابہ نے تائید اور حمایت فرمائی، حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

لا تقولوا فی عثمان رضی اللہ عنہ إلّا خیراً فواللہ ما فعل الذی فعل فی المصاحف الاّ عن ملامنا۔[1]

’’عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں کوئی بات ان کی بھلائی کے سوا نہ کہو، کیونکہ اللہ کی قسم انہوں نے مصاحف کے معاملہ میں جو کام کیا وہ ہم سب کی موجودگی میں اور مشورے سے کیا۔‘‘

(۱) عسقلانی، فتح الباری، ۹:۱۸

اَحادیثِ نبوی ﷺ کی حفاظت و دائمیت

ارشادِ ربانی ہے:

اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّكۡرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ۝ (1)

’’بیشک یہ ذکرِ عظیم (قرآن) ہم نے ہی اتارا ہے اور یقیناً ہم ہی اس کی حفاظت کریں گے۝‘‘

قران کی حفاظت اس وقت تک ممکن ہی نہیں جب تک حدیث کی حفاظت نہ ہو اس لیے جب قرآن یہ کہتا ہے کہ قرآن کی حفاظت اللہ کے ذمہ ہے تو فی الحقیقت اس سے مراد یہ ہے کہ قرآن اور حدیث دونوں کی حفاظت اللہ کے ذمے ہے۔

مذکورہ بالا آیت میں الذکر سے مراد قرآن ہے قرآن صرف الفاظ کا نام نہیں بلکہ الفاظ اور معانی کے مجموعے کا نام قرآن ہے۔ فقہا جب فقہ کے ماخذ بیان کرتے ہوئے قرآن پر بطور ماخذ فقہ بحث کرتے ہیں تو قرآن کی تعریف بتلاتے ہوئے یہی کہتے ہیں کہ قرآن نظم اور معنی دونوں کے مجموعے کا نام ہے۔ مسائل فقہ کا استنباط کرنے کے لیے قران کے نظم اور معنی یعنی قرآن کے الفاظ اور ان کے معانی دونوں کا لحاظ رکھنا لازمی ہے اس کے بغیر مسائل کا استنباط ممکن ہی نہیں۔

حفاظت قرانی کو اپنی ذمہ داری میں لےکر اللہ تعالیٰ نے اس حقیقت کو واضح فرما دیا کہ قرآن کے الفاظ اور اس کے معانی دونوں من جانب اللہ ہیں، جس طرح حضور اکرم ﷺ الفاظ قرآنی کو بیان کرنے والے ہیں اسی طرح معانی قرانی کو بھی صرف آپ ہی بیان فرماتے ہیں۔ نہ قرآن کے الفاظ آپ کے اپنے ہیں نہ ان الفاظ کے معانی آپ نے اپنی طرف سے متعین کرلیے، الفاظ کا نزول بھی اللہ تعالیٰ ہی کی جانب سے ہوا اور معانی و مطالب کا تعین بھی اللہ تعالیٰ ہی نے فرمائی۔ یہ سب کچھ وحی الٰہی کی مدد سے ہوا:

(۱) الحجر، ۱۵: ۹

وَمَا يَنۡطِقُ عَنِ الۡهَوٰى اِنۡ هُوَ اِلَّا وَحۡىٌ يُّوۡحٰى (اور وہ (اپنی) خواہش سے کلام نہیں کرتے۔اُن کا ارشادسَراسَر وحی ہوتی ہے جو انہیں کی جاتی ہے۔) سے تعبیر کرتا ہے۔

اگر یہ امر مسلمہ ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ کے علاوہ کوئی بھی شخص قرآنی آیات کا صحیح مفہوم متعین کرنے کا اہل نہیں تو پھر احادیث نبوی کی حفاظت کے بغیر قرآن کی حفاظت کا تصور بے معنی ہے اور اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے قرآن کی حفاظت کے ساتھ ساتھ قرآن کی شرح وتفسیر یعنی حدیث کی حفاظت کا بھی ذمہ لیا ہے۔ یہ آیات دوبارہ پڑھیے:

اِنَّ عَلَيۡنَا جَمۡعَهٗ وَ قُرۡاٰنَهٗ ۝ فَاِذَا قَرَاۡنٰهُ فَاتَّبِعۡ قُرۡاٰنَهٗ ۝[1]

”بے شک اسے (آپ کے سینہ میں) جمع کرنا اور اسے (آپ کی زبان سے) پڑھانا ہمارا ذِمّہ ہے ۝ پھر جب ہم اسے (زبانِ جبریل سے) پڑھ چکیں تو آپ اس پڑھے ہوئے کی پیروی کیا کریں ۝“

قرآن کے جمع و بیان کا اللہ کے ذمہ کرم پر ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ جس طرح متن قرآنی کو اللہ تعالیٰ نے اپنی حفاظت میں لے کر ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا اسی طرح اس کے بیان کو اپنی حفاظت میں لے کر اس کے بیان اور توضیح کے واحد مستند سرچشمے یعنی حدیث نبوی کی حفاظت کی ضمانت بھی عطا فرما دی۔

احادیثِ نبوی ﷺ کی حفاظت کا نادر الوجود منہج

احادیثِ نبوی کی حفاظت کا جو منہج محدثین کرام نے اختیار کیا اس کی کوئی نظیر تاریخ انسانی میں نہیں ملتی۔ اس باب میں نہ صرف متن حدیث کو مرکز توجہ بنایا گیا بلکہ متن حدیث تک رسائی کے ذرائع کو بھی کمال اہمیت دی گئی۔ حدیث کے متن روایت کرنے والے کے بارے میں یہ قرار دیا گیا کہ اس کی یادداشت اچھی ہو وہ قوی حافظہ رکھتا ہو۔ وہ دیانت دار ہو۔ مخلصانہ سچائی پر رہتا ہو یہ قوی حفظ اور مخلصانہ سچائی ہی وہ

(۱) القیامۃ، ۷۵: ۱۷، ۱۸

بنیادی اصول ہیں جنہیں فن حدیث میں تعدیل کا محور قرار دیا گیا۔ بقیہ اصول انہی اصولوں کی تفصیل ہیں۔ مثلاً یہ کہ:

(۱) راوی حفظ و روایت کی اعلیٰ ملکیت کا حامل ہو۔

(۲) وہ معروف ہو۔

(۳) راوی مقبولیت کا حامل ہو۔

(۴) راوی کے کردار پر تنقید نہ کی گئی ہو۔

(۵) راوی سماجی آداب و وقار کا حامل ہو۔

روایت کی یہی اہمیت ہے کہ ثقہ طرز روایت کو صرف متن حدیث کی قابل اعتماد روایت کے لیے ہی ضروری نہیں سمجھا گیا بلکہ محدثین نے اسے من حیث الکل انسانی شخصیت کی شعوری صحت و سلامتی کے لیے بھی ناگزیر قرار دیا:

عَنْ عَبْدِ السَّلَامِ بْنِ أَبِي صَالِحٍ أَبِي الصَّلْتِ الْهَرَوِيِّ عَنْ عَلِيِّ بْنِ مُوْسَى الرِّضَا، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ جَعْفَرِ بْنِ مُحَمَّدٍ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ عَلِيِّ بْنِ الْحُسَيْنِ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ رضی الله عنهم، قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: الإِيْمَانُ مَعْرِفَةٌ بِالْقَلْبِ وَ قَوْلٌ بِاللِّسَانِ وَ عَمَلٌ بِالأَرْكَانِ. قَالَ أَبُو الصَّلْتِ: لَوْ قُرِئَ هَذَا الإِسْنَادُ عَلَى مَجْنُوْنٍ لَبَرَأَ. (۱)

’’حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ایمان نام ہے دل سے پہچاننے، زبان سے اقرار کرنے اور ارکان پر عمل کرنے کا۔ (راوی) ابو صلت ہروی فرماتے ہیں: اگر یہ سند پاگل پر پڑھ کر دم کی

(۱) ۱۔ ابن ماجه، السنن، المقدمة، باب فی الإيمان، ۱: ۲۵، رقم: ۶۵
۲۔ طبرانی، العمجم الأوسط، ۶: ۲۲۶، رقم: ۶۲۵۴
۳۔ بیہقی، شعب الإيمان، ۱: ۴۷، رقم: ۱۶

جائے تو وہ ٹھیک ہو جائے۔“

روایت کے باب میں اختیار کردہ اُصولوں کی مختصر تفصیل یوں ہے:

(۱) راوی حفظ و روایت کی اعلیٰ صلاحیت کا حامل ہو

راوی میں بات سننے، یاد رکھنے اور درستگی کے ساتھ بیان کرنے کی صلاحیت موجود ہو۔ ارشادِ نبوی ﷺ ہے کہ کئی روایت کرنے والے ایسے ہوتے ہیں جو خود بات کی تہہ تک نہیں پہنچتے۔ لیکن جن کے پاس روایت کرتے ہیں وہ ان سے زیادہ اس بات کو پا لیتے ہیں۔ سو راوی کمزور ہونے سے مراد سننے، یاد رکھنے اور روایت کرنے میں کمزور ہونا ہے۔ اس کے لیے سمجھنے میں فقیہ ہونا ضروری نہیں۔

(۲) راوی معروف ہو

حدیث کا راوی جن سے روایت لے رہا ہے اور جو اس سے روایت لے رہے ہیں ان میں جانا پہچانا ہو اور راویوں میں قابل اعتماد سمجھا جائے۔ اپنے شیخ کی مجلس میں کم موجود رہنے والے سے اس شخص کی روایت کہیں زیادہ لائق اعتماد ہو گی جس نے ان سے روایت سنی اور اسے اپنے شیخ روایت کے ہاں کبھی اٹھنے بیٹھنے کا اور زیادہ موقع ملا۔ وہ راوی زیادہ قابل اعتماد سمجھا جائے جو سچا بھی ہو اور اپنے شیخ کی مجلس میں اچھی جگہ پائے ہوئے ہو۔

(۳) راوی مقبولیت کا حامل ہو

راوی کی ثقاہت کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ لوگ جنھوں نے وہ بات سنی ،ان کا اس سے اتفاق رہا ہو۔ کسی نے اس کی بات سے انکار نہ کیا ہو۔ ایک شخص سے چار آدمی ایک بات سن کر گئے۔ ان میں سے ایک اس بات کو اسی طرح روایت کرتا ہے کہ باقی تین اس سے اتفاق نہیں کرتے۔ تو وہ شخص شاذ کا راوی یا منکر الروایۃ سمجھا جائے گا۔

کہ اس کی روایت کا انکار ثابت ہوچکا قبولیت کے لئے ضروری ہے کہ اس کی روایت کا کہیں انکار نہ کیا گیا ہو وہ ہمیشہ کے لیے اپنی بات میں مطاع اور قابل قبول رہے۔

(۴) راوی کے کردار پر تنقید موجود نہ ہو

راوی غلط کار اور فسق فی العمل نہ ہو بلکہ امین ہو۔ فاسق کی روایت کمزور ہوگی اور مزید تبیین کی محتاج ہوگی۔ اسی طرح فسق فی القول اور کذاب راوی بھی نہ ہی لائق تذکرہ ہے اور نہ اس کی روایت کسی درجہ میں لائق قبول ہوگی۔

(۵) سماجی وقار و آداب کا حامل ہو

راوی روایت کے باب میں بھی سماجی آداب و وقار کو ملحوظ رکھتا ہو۔ وہ ہر کس و ناکس سے روایت کرنے کی بجائے انہی سے روایت کرے جو حفظ وضبط میں پختہ ہوں اور امانت و دیانت کے اہل ہوں اور انہی کو روایت کرے جو اس کی بات میں کمی بیشی کرنے والے نہ ہوں۔ ایسا شخص اگر کبھی کسی غیر معروف شخص سے بھی روایت لے لے تو اس کی عام عادت کے سبب اس غیر معروف راوی کی بھی جہالۃ العین اٹھ جائے گی۔

روایت حدیث کے اصولوں کا یہ مختصر تذکرہ تاریخ علوم میں حدیث کی تدوین و روایت کے منہج کی عدیم المثلیت کو بیان کرتا ہے۔

۶۔ رسالتِ محمدی ﷺ کی خاتمیت

نبوت محمدی ﷺ کی خاتمیت نے آپ ﷺ کی سیرت طیبہ کو کائنات انسانی کی آخری پیغمبرانہ سیرت بنا دیا ہے۔ باری تعالیٰ نے ہر چند آپ ﷺ کو **خلقاً اوّل الانبیاء** بنایا مگر آپ ﷺ **بعثاً آخر الانبیاء** قرار دیئے گئے گویا آپ ﷺ نبوت کے ملنے میں سب سے مقدم کئے گئے مگر نبوت کے ظاہر کرنے میں سب سے موخر کئے گئے تاکہ اولین و آخرین کے تمام فضائل و کمالات آپ کے دامن نبوت میں سمیٹے جائیں۔

چونکہ آپ ﷺ کو خاتم الانبیاء بنایا گیا اس لئے آپ ﷺ کی سیرت طیبہ کو وہ کمال و دوام اور حسن و مقام عطا کیا گیا کہ خود سیرت کو آپ ﷺ سے منسوب ہونے پر فخر ہے۔ انسانیت کو آپ ﷺ کی شان ہونے پر فخر ہے، محبوبیت کو آپ ﷺ کی زینت ہونے پر فخر ہے، عبدیت کو آپ ﷺ کا مقام ہونے پر فخر ہے، نبوت کو آپ ﷺ کا منصب ہونے پر فخر ہے اور رسالت کو آپ ﷺ کی فضیلت ہونے پر فخر ہے۔ انسانیت ہزارہا سال سے اپنے بلوغ و ارتقاء کا سفر طے کرتی رہی اور نبوت و رسالت اپنے فضائل و کمالات کے مراحل سے گزرتی رہی جب انسان ذہنی، فکری اور شعوری طور پر حد بلوغ کو پہنچ گیا اور نبوت و رسالت جملہ محاسن کے ساتھ اپنی وسعت ابلاغ کے لحاظ سے عالمگیر ہونے کے قریب پہنچ گئی تو سلسلہ انبیاء کے خاتم سیدنا محمد مصطفیٰ ﷺ کو ساری کائنات بلکہ ہر زمان و مکان کے لئے دائمی و ابدی نبوت و رسالت کے شاہکار کے طور پر مبعوث فرما دیا گیا، آپ ﷺ کی آمد سے نظام نبوت کے بپا کئے جانے کا مقصد پورا ہو گیا، آپ ﷺ کی بعثت سے سلسلہ رسالت کے قیام کی غرض و غایت مکمل ہوگئی سو ضروری تھا کہ اب باب رسالت کسی بھی نئی بعثت کے لئے بند کر دیا جائے اور ختم نبوت کا دائمی اعلان کر دیا جائے تاکہ قیامت کے دن تک جملہ ادوار و زمن نبوت و رسالت محمدی ﷺ کے زیر سایہ رہیں اور آئندہ تمام انسانی نسلیں فیضان سیرت محمدی ﷺ سے پرورش پائیں۔ ختم نبوت کے الوہی اعلان کے بعد اب کسی شخص کا مدعی نبوت ہونا حقیقت میں قرآن و حدیث کا منکر اور دین اسلام سے مرتد ہونے کے علاوہ باری تعالیٰ کے عظیم منصوبہ ہدایت کا کھلا باغی ہونا بھی تصور کیا جائے گا کیونکہ اس نے اپنے ''اعلان'' سے فی الواقع نبوت و رسالت محمدی ﷺ کی خاتمیت کی الوہی حکمت اور حقیقی عظمت کو بزعم خویش رد کر دیا ہے اور معاذ اللہ تکمیل سلسلہ ہدایت کے الوہی منصوبہ کو ناکافی و ناقص سمجھتے ہوئے اسے اپنے تئیں مکمل کرنے کی گمراہانہ کوشش کی ہے۔ اور یہ حقیقت فراموش کر دی ہے کہ اگر علم الٰہی میں آپ ﷺ کے بعد کسی نئے نبی یا رسول کی بعثت کی ضرورت و گنجائش ہوتی تو حضور ﷺ کی تعلیمات (قرآن و سنت) کو حرفاً حرفاً محفوظ رکھنے کا اس قدر غیر معمولی اور عدیم المثال

اہتمام نہ کیا جاتا اور باری تعالیٰ ان کی حفاظت کا خود ذمہ دار نہ بنتا۔ جب یکے بعد دیگرے انبیاء و رسل کے مبعوث ہونے کا دور تھا اللہ تعالیٰ نے کسی نبی یا رسول کی الہامی کتب، وحی اور تعلیمات کی اس طرح حفاظت کا انتظام نہیں فرمایا۔ کیونکہ ہر زمانے میں حسب ضرورت انبیاء مبعوث ہو رہے تھے، اگر پہلی وحی اور تعلیمات محفوظ نہ رہ سکیں تو نئے نبی اور رسول نے آ کر انہی بنیادی تعلیمات کی پھر تجدید کر دی، انہیں دوبارہ یاد کروا دیا، پھر ایک زمانے کے لئے انسانی سینوں میں محفوظ کر دیا اور یوں یکے بعد دیگرے یہ سلسلہ جاری رہا۔ جب حضور نبی اکرم ﷺ کی بعثت ہوئی تو حفاظتِ تعلیمات کا جو نظام ہزار ہا سال سے چلا آ رہا تھا کلیتًا بدل دیا گیا اور تعلیمات محمدی ﷺ کو سینوں کے ساتھ ساتھ سفینوں میں بھی لفظاً و حرفاً اس طرح محفوظ کروا دیا گیا کہ کوئی تبدیلی نہ کی جا سکے۔ اس کا مقصد واضح طور پر انسانوں کو یہ باور کروانا تھا کہ اب اس نبی آخر الزمان ﷺ کے بعد حسب سابق کوئی نبی یا رسول مبعوث نہیں ہوگا اب قیامت تک یہی کتاب اور سیرت تمہارے کام آئے گی، اسے محفوظ رکھو۔ چنانچہ قرآن مجید نے بعثت محمدی ﷺ کے جملہ مقاصد کی تکمیل کا اعلان ان الفاظ میں کیا ہے:

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا۔ (۱)

”آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لئے اسلام کو (بطور) دین (یعنی مکمل نظام حیات کی حیثیت سے) پسند کر لیا۔“

حضور نبی اکرم ﷺ کی خاتمیت کا تذکرہ صرف قرآن مجید یا اسلامی ذرائع و مآخذ ہی نہیں کرتے بلکہ اس کی حیثیت آفاقی ہونے کی بنا پر ہے۔ تمام سابقہ صحف سماوی اس تذکرے سے مملو ہیں۔ بائبل کی کتاب استثناء میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے خطاب ہے:

(۱) المائدہ، ۵: ۳

’’اور خداوند نے مجھ سے کہا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں سو ٹھیک کہتے ہیں، میں اُن کے لئے انہی کے بھائیوں میں سے تیرے مانند ایک نبی برپا کروں گا، اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا، اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا وہی وہ ان سے کہے گا، اور جو کوئی میری ان باتوں کو جن کو وہ میرا نام لے کر کہے گا، نہ سنے تو میں ان کا حساب اُس سے لوں گا، لیکن جو نبی گستاخ بن کر کوئی ایسی بات میرے نام سے کہے جس کے کہنے کا میں نے اس کو حکم نہیں دیا، یا اور معبودوں کے نام سے کچھ کہے تو وہ نبی قتل کیا جائے، اور اگر تو اپنے دل میں کہے کہ جو بات خداوند نے نہیں کہی ہے اسے ہم کیونکر پہچانیں؟ تو پہچان یہ ہے کہ جب وہ نبی خداوند کے نام سے کچھ کہے، اور اس کے کہے کے مطابق کچھ واقع یا پورا نہ ہو تو وہ بات خداوند کی کہی ہوئی نہیں بلکہ اس نبی نے وہ بات خود گستاخ بن کر کہی ہے تو اس سے خوف نہ کرنا۔‘‘(۱)

اس عبارت میں بنی اسرائیل سے خطاب کرتے ہوئے یہ صراحت کی گئی ہے کہ جس نبی کی بشارت دی گئی ہے، وہ ان میں سے نہیں بلکہ ان کے بھائیوں یعنی بن اسمٰعیل میں مبعوث ہوگا، اور حضرت شعیاء علیہ السلام سے خطاب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد موجودہ بائبل میں منقول ہے کہ:

’’دیکھو! میرا خادم جس کو میں سنبھالتا ہوں، میرا برگزیدہ جس سے میرا دل خوش ہے، میں نے اپنی روح اس پر ڈالی، وہ قوموں میں عدالت جاری کرے گا، وہ نہ چلائے گا اور نہ شور کرے گا، اور نہ بازاروں میں اس کی آواز سنائی دے گی، وہ مسلے ہوئے سرکنڈے کو نہ توڑے گا، اور ٹمٹماتی بتی کو نہ بجھائے گا، وہ راستی سے عدالت کرے گا، اور ماندہ نہ ہوگا، اور ہمت نہ ہارے گا، جب تک عدالت کو زمین پر قائم نہ کرلے، جزیری اس کی شریعت کا انتظار کریں گے......

(۱) استثناء، ۱۸: ۱۷، ۲۲

’’میں ہی تیرا ہاتھ پکڑوں گا، اور تیری حفاظت کروں گا، اور لوگوں کے عہد اور قوموں کے نور کے لئے تجھے دوں گا، کہ تو اندھوں کی آنکھیں کھولے اور اسیروں کو قید سے نکالے، اور ان کو جو اندھیرے میں بیٹھے ہیں قید خانے سے چھڑالے، یہوواہ میں ہی ہوں، یہی میرا نام ہے، میں اپنا جلال کسی دوسرے کے لئے اور اپنی حمد کھودی ہوئی مورتوں کے لئے روانہ رکھوں گا......۔

’’اے سمندر پر گزرنے والو! اور اس میں بسنے والو! اے جزیرو! اور ان کے باشندو! خداوند کے لیے نیا گیت گاؤ، زمین پر سرتاسر اسی کی ستائش کرو، بیابان اور اس کی بستیاں، قیدار کے آباد گاؤں اپنی آوازیں بلند کریں، سلع کے بسنے والے گیت گائیں، پہاڑوں کی چوٹیوں پر سے للکاریں، وہ خداوند کا جلال ظاہر کریں، اور جزیروں میں اس کی ثناء خوانی کریں، خداوند بہادر کی مانند نکلے گا، وہ جنگی مرد کی مانند اپنی غیرت دکھائے گا...... جو کھودی ہوئی مورتوں پر بھروسہ کرتے اور ڈھالے ہوئے بتوں سے کہتے ہیں تم ہمارے معبود ہو وہ پیچھے ہٹیں گے اور بہت شرمندہ ہوں گے۔‘‘(۱)

اس عبارت میں یہ واضح کردیا گیا ہے کہ جس نبی ﷺ کی بشارت دی جارہی ہے وہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے ہوں گے (کیونکہ قیدار انہی کے صاحبزادے کا نام ہے اور سلع (مدینہ طیبہ کے مشہور پہاڑ) کے بسنے والے اس کی آمد پر خوشیاں منائیں گے، اس کا خاص مقابلہ بت پرستوں سے ہوگا، اور وہ اپنے حلقہ اثر میں بت پرستی کا خاتمہ کردے گا، اسے متعدد اقوام سے جنگیں بھی پیش آئیں گی، اور بالآخر وہ غالب آکر ان اقوام میں نظام عدل نافذ کرے گا۔

موجودہ بائبل کے عہد نامہ قدیم میں اس قسم کی اور بھی بہت سی بشارتیں اب تک موجود ہیں اور انہی کی وجہ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تشریف آوری کے وقت تک لوگوں

(۱) یسعیاہ، ۴۲: ۱۔۱۷

میں یہ بات مشہور و معروف تھی کہ مسیح علیہ السلام کے علاوہ ایک اور عظیم الشان نبی ﷺ دنیا میں تشریف لانے والے ہیں، چنانچہ انجیل یوحنا میں مذکور ہے کہ جب حضرت یحییٰ علیہ السلام تشریف لائے تو لوگوں نے اُن سے پوچھا کہ کیا آپ وہی نبی ﷺ ہیں جن کی بشارت پچھلے انبیاء علیہم السلام دیتے آ رہے ہیں؟ حضرت یحییٰ علیہ السلام نے اس کا انکار کیا انجیل یوحنا کی عبارت یہ ہے:

''اور یوحنا کی گواہی یہ ہے کہ جب یہودیوں نے یروشلم سے کاہن اور لاوی یہ پوچھنے کے لئے اس کے پاس بھیجے کہ تو کون ہے؟ تو اس نے اقرار کیا اور اس نے انکار نہ کیا، بلکہ یہ اقرار کیا کہ میں تو مسیح نہیں ہوں، انہوں نے اس سے پوچھا پھر تو کون ہے؟ کیا تو ایلیاہ ہے؟ اس نے کہا میں نہیں ہوں، کیا تو وہ نبی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ نہیں......۔''(۱)

اس سے واضح ہے کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کے زمانے میں بھی لوگ حضرت مسیح علیہ السلام کے علاوہ ایک اور نبی ﷺ کے منتظر تھے اور وہ نبی ﷺ اُن کے درمیان اس قدر مشہور و معروف تھے کہ اُن کے نام لینے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی جاتی تھی، بلکہ وہ نبی ﷺ کہنا کافی ہوتا تھا۔

پھر جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائے تو انہوں نے بھی حضور نبی اکرم ﷺ کا صریح اسمِ گرامی لوگوں کو بتا کر آپ ﷺ کی تشریف آوری کی بشارت دی، انجیل یوحنا میں مسیح علیہ السلام کا یہ ارشاد منقول ہے کہ:

''میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لئے فائدہ مند ہے، کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ (فارقلیط) تمہارے پاس نہ آئے گا، لیکن اگر جاؤں گا تو اُسے تمہارے پاس بھیج دوں گا اور وہ آ کر دنیا کو گناہ اور راستبازی اور عدالت کے بارے میں قصوروار ٹھہرائے گا۔''(۲)

(۱) انجیل، یوحنا، ۱: ۱۹۔۲۶

(۲) یوحنا، ۱۶: ۷

۷۔ مقاصدِ بعثتِ رسالت کی تمامیت

حضور نبی اکرم ﷺ نے جس عظیم اور عالمی پیغمبرانہ مشن کا مکہ معظّمہ سے آغاز فرمایا تھا وہ آپ ﷺ کی حیات ظاہری میں ہی بتمام وکمال کامیابی و کامرانی سے ہمکنار ہوگیا۔ اس پیغمبرانہ جدوجہد کی کامیابی کا پہلا مرحلہ ۱ھ میں اسلامی ریاست مدینہ کا قیام تھا دوسرا ۸ھ میں فتح مکہ، تیسرا ۱۰ھ میں خطبہ حجۃ الوداع کے ذریعے نیو ورلڈ آرڈر کا اعلان تھا اور چوتھا مشرق سے مغرب تک عالمی سطح پر اسلامی دعوت کی تحریک کو بپا کردینا تھا۔ اس کی تفصیلات آگے متعلقہ مقامات پر آرہی ہیں مگر یہ اعزاز و امتیاز تاریخ میں صرف رسالت و سیرت محمدی ﷺ کو ہی نصیب ہوا کہ اپنی ظاہری حیات مبارکہ کے اندر ہی اپنے مشن کو ہر جہت اور ہر اعتبار سے پایہ تکمیل تک پہنچا دیا اور لیظھرہ علی الدین کلہ کا وہ تاریخی ساز انقلابی اعلان جو آپ ﷺ کے مقصد بعثت کے طور پر کیا گیا تھا اس کی حتمی کامیابی کے نتائج صحیفہ ارضی پر مرتسم ہوگئے۔ پھر کامیابی اور نتیجہ خیزی کا یہ عمل تسلسل کے ساتھ حضور نبی اکرم ﷺ کی وفات کے بعد بھی صدیوں تک جاری رہا۔ بالآخر فروغ دعوت حق کا یہ سلسلہ روئے زمین کی ان حدود تک جا پہنچا جن کا مشاہدہ حضور ﷺ کو کروایا گیا تھا۔

یہاں فقط ایک حوالہ ہی اس حقیقت کو واضح کرنے کے لئے کافی ہے۔ دور حاضر کے ایک غیر مسلم مؤرخ اور محقق Michael H. Hart نے اپنی معروف تصنیف The 100, A Ranking of the Most Influential persons in History میں کائنات انسانی کی تاریخ میں عظیم، نامور اور تاریخی کارہائے نمایاں کی حامل شخصیات کی فہرست میں حضور نبی اکرم ﷺ کا اسم گرامی سب سے پہلے نام کے طور پر لکھا ہے وہ خود اس کی وجہ ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

> My choice of Muhammad to lead the list of the world's most influential persons may surprise some readers and may be questioned by others, but he was the only man in history who was supremely successful

on both the religious and secular levels despite of humble origins, Muhammad founded and promulgated one of the worlds great religions and became immensely effective political leader. Today, thirteen centuries after his death, his inflence is still powerful and pervasive.

It may initially seem strange that Muhammad has been ranked higher than Jesus. There are two principal reasons for that decision. First, Muhammad played a far more important role in the development of islam than that done by Jesus for Christianity Furthermore, Muhammad (unlike Jesus) was a secular as well as a religious leader. In fact, as the driving force behind the Arab conquests, he may well rank as the most inflential political leader of all time.

It is this unparalleed combination of secular and religious inflence which I feel entitles Muhammad to be considerd the most influential single figure in human history.

’’دنیا کی سب ذی اثر شخصیات میں سے محمد ﷺ کا میرا پہلا انتخاب، کچھ قارئین کو حیران کر دے گا اور ہوسکتا ہے بعض حلقوں کی طرف سے اس پر سوال کیا جائے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ذات محمد ﷺ ہی وہ ذات اقدس ہے جو دنیوی و مادی اور مذہبی و روحانی دونوں سطحوں پر سب سے بڑھ کر کامیاب رہی۔ ایک انتہائی متوسط خاندان سے تعلق رکھنے والے محمد ﷺ نے نہ صرف دنیا کے ایک عظیم مذہب کی بنیاد رکھی بلکہ اس کی اشاعت بھی کی اور ایک انتہائی سحر انگیز سیاسی موثر راہنما بن گئے۔ ان کی وفات کے تیرہ سو سال بعد ان کا اثر آج بھی پائدار، مضبوط اور اسی طرح جاری و ساری ہے۔

’’ابتدائی طور پر یہ بات حیرت انگیز ہوسکتی ہے کہ حضرت محمد ﷺ کا رتبہ و مرتبہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے بلند تر ہے۔ اس فیصلے کی دو بنیادی وجوہات ہیں: اول یہ کہ حضرت محمد ﷺ نے اشاعت اسلام اوراس کی ترویج و ترقی میں جو کچھ کیا وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عیسائیت کی تبلیغ و اشاعت سے کہیں بڑھ کر ہے۔

’’علاوہ ازیں حضرت محمد ﷺ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے برعکس مذہبی و لا دینی سبھی لوگوں کے راہنما تھے۔ فی الحقیقت عربوں کی فتوحات کے پیچھے انہی کی زبردست قوت کام کر رہی تھی۔ انہیں بلا تامل تاریخ کی ایسی اثر انگیز اور موثر شخصیت کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے جن کی مثال نہیں ملتی اور نہ ہی مل سکتی ہے۔ مذہب و دنیاوی زندگی پر ان کے وہ عظیم اور گہرے اثرات ہیں جن کی وجہ سے میں سمجھتا ہوں کہ محمد ﷺ تاریخ انسانی کی واحد مثال ہیں۔‘‘

اس امر کا بیان A.J. Arberry نے ان الفاظ میں کیا ہے:

When he (Muhammad) died in 634, Islam was secure as the paramount religion and political system of all Arabia.[1]

’’جب ۶۳۴ء میں حضرت محمد ﷺ کا وصال ہوا اس وقت اسلام پورے خطہ عرب میں ایک غالب دین اورسیاسی نظام کے طور پر مستحکم ہو چکا تھا۔‘‘

وہ مزید لکھتے ہیں:

From the Atlantic coast, to the borders of China the call to prayer, in the tongue of Macca, rang out from minaret, summoning the faithful to prostrate themselves to the Lord of the world. The rapidity spread of Islam, through extensive provinces which had long been Christian, is a crucial fact of history

(1) A.J. Arberry, *Aspects of Islamic Civilization*, p. 11.

which has naturally engaged the speculative allousion of many critical investigator.(1)

’’وادی مکہ سے اٹھنے والی حق کی یہ آواز ہر طرف پھیل چکی تھی۔ بحر اوقیانوس کے ساحل سے لے کر چین کی سرحدوں تک مساجد کے میناروں سے بلند ہونے والی صدائے دلنواز اہل ایمان کو رب کائنات کے حضور سربسجود ہونے کی دعوت دے رہی تھی۔ اسلام کی اس درجہ تیزی سے اشاعت خصوصاً ان دور دراز علاقوں میں جو عرصہ دراز سے عیسائی رہ چکے تھے ایک ایسی اٹل تاریخی حقیقت ہے جس نے بہت سے نقاد تاریخ نگاروں کی توجہ کو بدیہی طور پر اپنی طرف مبذول کر لیا ہے۔‘‘

اس کتاب میں حضور نبی اکرم ﷺ کی شخصیتی اور رسالتی جہت سے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا جو اس حقیقت کو واضح اور اَلم نشرح کر دیتا ہے کہ حضور نبی اکرم ﷺ کی سیرت مبارکہ کا مطالعہ صرف ایک دینی اور مذہبی یا الوہی ضرورت نہیں ہے بلکہ ایک معاشرتی، سماجی، انسانی اور شخصیتی ضرورت بھی ہے۔ یعنی ایک مثالی معاشرے کی تشکیل کے لیے مثالی شخصیات کا ہونا بہت ضروری ہے۔ جب تک معاشرے کے افراد مثالی نہیں ہوں گے معاشرے کی ہیئت اجتماعیہ مثالی حیثیت اختیار نہیں کر سکتی اور اگر افراد کو حامل کردار بنانا ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ ان کے سامنے ایک ایسا رول ماڈل ہو جس کی پیروی کر کے وہ اس معیار کو حاصل کرنے کی جدوجہد کریں اور معاشرے کے اہم اجزائے ترکیبی بن سکیں۔ اس حوالے سے اگر کوئی مثالی شخصیت کامل نمونہ ہو سکتی ہے تو حضور نبی اکرم ﷺ کی ذات مبارکہ ہے۔

وہ دانائے سبل ختم رسل مولائے کل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادی سینا
نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر
وہی قرآن وہی فرقان وہی یٰسین وہی طٰہٰ

(1) A.J. Arberry, *Aspect of Islamic Civilization*, p. 12.

مآخذ و مراجع

۱۔ **القرآن الحکیم۔**

۲۔ **آلوسی**، ابوالفضل شہاب الدین السید محمود (م ۱۲۷۰ھ/۱۸۵۴ء)۔ **روح المعاني في تفسیر القرآن العظیم والسبع المثاني**۔ بیروت، لبنان: دار الاحیاء التراث۔

۳۔ **احمد بن حنبل**، ابو عبد اللہ بن محمد (۱۶۴۔۲۴۱ھ/۷۸۰۔۸۵۵ء)۔ **المسند**۔ بیروت، لبنان: المکتب الاسلامی، ۱۳۹۸ھ/ ۱۹۷۸ء۔

۴۔ **بخاری**، ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل بن ابراہیم بن مغیرہ (۱۹۴۔۲۵۶ھ/۸۱۰۔۸۷۰ء)۔ **الصحیح**۔ بیروت، لبنان + دمشق، شام: دار القلم، ۱۴۰۱ھ/ ۱۹۸۱ء۔

۵۔ **بیہقی**، ابو بکر احمد بن حسین بن علی بن عبد اللہ بن موسیٰ (۳۸۴۔۴۵۸ھ/ ۹۹۴۔۱۰۶۶ء)۔ **شعب الإیمان**۔ بیروت، لبنان: دارالکتب العلمیہ، ۱۴۱۰ھ/ ۱۹۹۰ء۔

۶۔ **ترمذی**، ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن سورہ بن موسیٰ بن ضحاک سلمی (۲۱۰۔۲۷۹ھ/ ۸۲۵۔۸۹۲ء)۔ **السنن**۔ بیروت، لبنان: دار الغرب الاسلامی، ۱۹۹۸ء۔

۷۔ **حاکم**، ابو عبد اللہ محمد بن عبد اللہ بن محمد (۳۲۱۔۴۰۵ھ/۹۳۳۔۱۰۱۴ء)۔ **المستدرک علی الصحیحین**۔ بیروت۔ لبنان: دار الکتب العلمیہ، ۱۴۱۱/ ۱۹۹۰۔

۸۔ **ابن حبان**، ابو حاتم محمد بن حبان بن احمد بن حبان (۲۷۰۔۳۵۴ھ/ ۸۸۴۔۹۶۵ء)۔ **الصحیح**۔ بیروت، لبنان: مؤسسۃ الرسالہ، ۱۴۱۴ھ/۱۹۹۳ء۔

۹۔ **ابن حجر عسقلانی**، احمد بن علی بن محمد بن محمد بن علی بن احمد کنانی (۷۷۳۔۸۵۲ھ/ ۱۳۷۲۔۱۴۴۹ء)۔ فتح الباري شرح صحيح بخاري۔ لاہور، پاکستان: دار نشر الکتب الاسلامیہ، ۱۴۰۱ھ/ ۱۹۸۱ء۔

۱۰۔ **حسام الدین ہندی**، علاء الدین علی متقی (م ۹۷۵ھ)۔ كنز العمال في سنن الأقوال والأفعال۔ بیروت، لبنان: مؤسسۃ الرسالہ، ۱۳۹۹/ ۱۹۷۹۔

۱۱۔ **خطیب تبریزی**، ولی الدین ابو عبد اللہ محمد بن عبد اللہ (۷۴۱ھ)۔ مشكوة المصابيح۔ بیروت، لبنان، دار الکتب العلمیۃ، ۱۴۲۴ھ/۲۰۰۳ء۔

۱۲۔ **دارقطنی**، ابو الحسن علی بن عمر بن احمد بن مہدی بن مسعود بن نعمان (۳۰۶۔ ۳۸۵ھ/ ۹۱۸۔۹۹۵ء)۔ السنن۔ بیروت، لبنان: دار المعرفہ، ۱۳۸۶ھ/ ۱۹۶۶ء۔

۱۳۔ **عبد العظیم زرقانی**، محمد۔ مناهل العرفان في علوم القرآن۔ بیروت، لبنان: دار الفکر، ۱۴۱۶ھ/۱۹۹۶ء۔

۱۴۔ **زرکشی**، محمد بن بہادر بن عبد اللہ ابو عبد اللہ (۷۴۵۔۷۹۴ھ)۔ البرهان في علوم القرآن۔ بیروت، لبنان: دار المعرفہ، ۱۳۹۱ھ۔

۱۵۔ **سیوطی**، جلال الدین ابو الفضل عبد الرحمٰن بن ابی بکر بن محمد بن ابی بکر بن عثمان (۸۴۹۔۹۱۱ھ/ ۱۴۴۵۔ ۱۵۰۵ء)۔ الإتقان في علوم القرآن۔ لبنان، مطبعہ أمیر، منشورات الرضی بیدار۔

۱۶۔ **شاہ ولی اللہ**، محدث دہلوی (۱۱۱۴۔۱۱۷۴ھ/۱۷۰۳۔۱۷۶۲ء)۔ الفوز الكبير۔ لاہور، پاکستان: مکتبۃ العلمیہ۔

۱۷۔ **طبرانی**، ابو القاسم سلیمان بن احمد بن ایوب بن مطیر اللخمی (۲۶۰۔۳۶۰ھ/ ۸۷۳۔۹۷۱ء)۔ المعجم الأوسط۔ ریاض، سعودی عرب: مکتبۃ المعارف،

۱۴۰۵ھ/ ۱۹۸۵ء۔

۱۸۔ **طبرانی**، ابو القاسم سلیمان بن احمد بن ایوب بن مطیر اللخمی (۲۶۰۔۳۶۰ھ/ ۸۷۳۔۹۷۱ء)۔ **المعجم الکبیر**۔ موصل، عراق: مطبعۃ الزہراء الحدیثۃ۔

۱۹۔ **قرطبی**، ابو عبد اللہ محمد بن احمد بن محمد بن یحییٰ بن مفرج اُموی (۲۸۴۔۳۸۰ھ/ ۸۹۷۔۹۹۰ء)۔ **الجامع لأحکام القرآن**۔ بیروت، لبنان: دار احیاء التراث العربی۔

۲۰۔ **ابن کثیر**، ابو الفداء اِسماعیل بن عمر (۷۰۱۔۷۷۴ھ/ ۱۳۰۱۔۱۳۷۳ء)۔ **تفسیر القرآن العظیم**۔ بیروت، لبنان: دار المعرفہ، ۱۴۰۰ھ/ ۱۹۸۰ء۔

۲۱۔ **ابن ماجہ**، ابوعبد اللہ محمد بن یزید قزوینی (۲۰۹۔۲۷۳ھ/ ۸۲۴۔۸۸۷ء)۔ **السنن**۔ بیروت، لبنان: دار الکتب العلمیہ، ۱۴۱۹ھ/ ۱۹۹۸ء۔

۲۲۔ **مسلم**، ابن الحجاج ابو الحسن القشیر ی النیسابوری (۲۰۶۔ ۲۶۱ھ/ ۸۲۱۔۸۷۵ء)۔ **الصحیح**۔ بیروت، لبنان: دار احیاء التراث العربی۔

۲۳۔ **مناوی**، عبدالرؤف بن تاج العارفین بن علی بن زین العابدین (۹۵۲۔۱۰۳۱ھ/ ۱۵۴۵۔۱۶۲۱ء)۔ **فیض القدیر شرح الجامع الصغیر**۔ مصر: مکتبہ تجاریہ کبریٰ، ۱۳۵۶ھ۔

۲۴۔ **ہیثمی**، نور الدین ابو الحسن علی بن ابی بکر بن سلیمان (۷۳۵۔۸۰۷ھ/ ۱۳۳۵۔۱۴۰۵ء)۔ **مجمع الزوائد**۔ قاہرہ، مصر: دار الریان للتراث + بیروت، لبنان: دار الکتاب العربی، ۱۴۰۷ھ/ ۱۹۸۷ء۔

۲۵۔ **کتاب مقدس**، بائبل سوسائٹی، انار کلی، لاہور

26. A. J. Arberry, *Aspects of Islamic Civilization*.London

1964.

27. Gustave Edmund Von Grunebaum, *Classical Islam: A History*, 600-1258.

28. Murad Wahbah, *Islam and Civilization: Proceedings of the First International Islamic Philosophy Conference* Ain Shams University Press, 1982.

www.MinhajBooks.com